الرسالہ

ISSN 0970-180X

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

منفی نفسیات میں جینے والا انسان تاریخ کا معمول ہوتا ہے
اور ایجابی نفسیات میں جینے والا انسان تاریخ کا عامل

جون ۱۹۸۸

شمارہ ۱۳۹

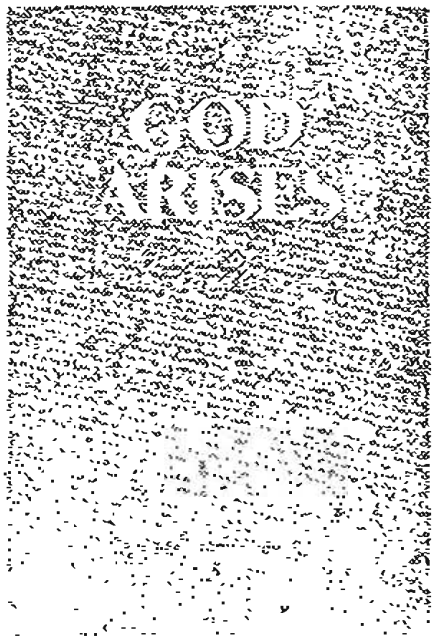

God Arises

By Maulana Wahiduddin Khan

This is the translation with some additions of *Mazhab Aur Jadeed Challenge*, translated into Arabic as *Al-Islam Yatahaddah*, which became a best-seller throughout the Arab world. It has also been translated into a number of other languages including Turkish, Malay, Serbo-Croatian (Yugoslavian), Sindhi, etc., and has come to be accepted as a standard work on the Islamic position vis-à-vis modern thought.

"*... in the fourteen hundred years of Islamic history, innumerable books on Islam have appeared. There are just a few books calling mankind to God which are clearly distinguishable from the rest because of the clarity and force with which they make their appeal. Without doubt, this book is one of that kind*".

— Daily AL-AHRAM (Cairo)

Pages 265 ISBN 81-85063-14-1 (Pbk) 81-85063-17-6 (Hbd) Price Rs. 45

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۳۹ — جون ۱۹۸۸ء

	صفحہ		صفحہ
تنقید اور عملی کارروائی	۲	مومنانہ طریقہ	۱۵
یہ حاملین اسلام	۳	برا فیصلہ	۱۶
حد کو پار نہ کیجئے	۴	امتحان	۱۷
جوش بغیر ہوش	۵	کتمانِ شہادت	۱۸
الٹا سفر	۶	شعور اور عمل	۱۹
ہر قسم کے مواقع	۷	لفظ یا حقیقت	۲۰
مقصد کی اہمیت	۸	ایک تجربہ	۲۲
پیغمبرانہ طریقہ	۹	غلط فہمی	۲۳
اصحاب رسول	۱۰	عبرت ناک	۲۵
حقیقی شخصیت	۱۱	ایک سفر	۲۶
اعتراف	۱۲	غلط ذہن	۴۴
دنیا سے آخرت لینا	۱۳	خبرنامہ اسلامی مرکز	۴۵

ماہنامہ الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳، فون: 697333, 611128

تنقید اور عملی کارروائی

ایک صاحب نے کہا کہ آپ دوسروں پر تنقید کرتے ہیں۔ اس سے امت میں تفریق پیدا ہوتی ہے۔ حالاں کہ آپ خود لکھ چکے ہیں کہ حضرت موسیٰ کی غیر موجودگی میں جب بنی اسرائیل بچھڑے کو پوجنے لگے تو حضرت ہارون نے خاموشی اختیار کرلی۔ تذکیر القرآن میں آپ نے لکھا ہے کہ بہت سے مواقع پر دین کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ باہمی لڑائی سے بچنے کے لیے خاموشی کا طریقہ اختیار کرلیا جائے، حتی کہ شرک جیسے معاملہ میں بھی (حصہ دوم صفحہ ۸۷)

میں نے کہا کہ آپ نے میری بات کو غلط صورت میں نقل کیا۔ میں نے جو بات لکھی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت ہارون نے بنی اسرائیل کی گمراہی پر لسانی اظہار تو پوری طرح کیا، مگر جب وہ اصلاح قبول کرنے پر راضی نہ ہوئے تو ان کے خلاف عملی کارروائی نہیں کی۔ گویا فکری تنقید تو ہر حال میں ضروری ہے۔ البتہ عملی اقدام حالات کے لحاظ سے کیا جائے گا۔ متعلقہ آیات کے سلسلہ میں یہاں صفوۃ التفاسیر (محمد علی الصابونی) سے دو حوالے نقل کیے جاتے ہیں:

(قال ابنَ امّ ان القوم استضعفونی وکادوا یقتلوننی) ای ان القوم استذلونی وقهرونی وقاربوا قتلی حین نهیتهم عن ذالك فانا لم اقصّر فی نصحهم

(المجلد الاول، صفحہ ۴۷۳)

"ہارون نے کہا کہ اے میری ماں کے بیٹے، قوم نے مجھ کو دبالیا اور قریب تھا کہ مجھ کو مار ڈالیں" یعنی قوم نے مجھ کو کمزور سمجھا اور مجھ پر غالب آگئی اور میرے قتل کے قریب ہوگئی جب کہ میں نے ان کو اس سے روکا۔ پس میں نے نصیحت میں کوتاہی نہیں کی۔

(انی خشیت ان تقول فرقت بین بنی اسرائیل) ای انی خفت ان زجرتهم بالقوة ان یقع قتال بینهم

المجلد الثانی، صفحہ ۲۴۵

"مجھے ڈر تھا کہ تم کہو گے کہ تم نے بنی اسرائیل کے درمیان پھوٹ ڈال دی" یعنی مجھے اندیشہ ہوا کہ اگر میں انھیں طاقت سے روکوں تو ان کے درمیان جنگ برپا ہو جائے گی

تفریق امت سے بچنا ضروری ہے، مگر اس کا اعتبار عملی احتساب میں کیا جائے گا نہ کہ نظری احتساب میں۔

یہ حاملینِ اسلام

صلح حدیبیہ کا واقعہ ۶ھ میں پیش آیا۔ اسی سال کے آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اطرافِ عرب کے حاکموں اور بادشاہوں کو دعوتی خطوط روانہ کیے۔ انھیں میں سے ایک خط وہ تھا جو دحیہ کلبی کے ذریعہ شاہِ روم ہرقل (Heraclius) کے نام بھیجا گیا۔ یہ مسیحی تھا اور نہایت ذہین اور حقیقت پسند آدمی تھا۔

ہرقل اس وقت فلسطین میں تھا۔ اس زمانہ میں عرب کے لوگ تجارت کی غرض سے اس علاقہ میں جایا کرتے تھے۔ چنانچہ ہرقل نے تحقیق حال کے لیے کچھ عربوں کو بلوایا جن میں ابوسفیان بن حرب بھی شامل تھے۔ ہرقل نے ترجمان کے ذریعہ ان سے گفتگو کی۔ ایک روایت کے مطابق، گفتگو کا ایک حصہ یہ تھا:

قال اخبرنی یا اباسفیان۔ فقال هو ساحر کذاب ویس بنبی۔ فقال هرقل انی لا اُرید شتمه ولکن کیف نسبه فیکم --- کیف عقله ورأیه

(سیرۃ ابن کثیر، المجلد الثالث، صفحہ ۵۰۳)

ہرقل نے کہا کہ اے ابوسفیان مجھے محمد کے بارے میں بتاؤ۔ ابوسفیان نے کہا کہ وہ جادوگر اور جھوٹے ہیں، وہ پیغمبر نہیں۔ ہرقل نے کہا میں تم سے ان کی سب وشتم سننا نہیں چاہتا۔ بلکہ مجھے یہ بتاؤ کہ ان کا حسب ونسب کیا ہے، ان کی سمجھ کیسی ہے اور ان کی رائے کیسی ہے۔

ہرقل ایک "کافر" تھا۔ وہ کافر ہی رہا اور کافر ہی مرا۔ مگر اس کو اِس سے دل چسپی نہیں تھی کہ کوئی شخص اس کے حریف کے بارہ میں برے الفاظ بولے اور وہ اس کو سن کر خوش ہو۔ بلکہ اس کی دل چسپی اس میں تھی کہ وہ جانے کہ جو شخص اس کا حریف بن کر ابھرا ہے، وہ خاندانی شرافت اور ذہنی صلاحیت کے اعتبار سے کیسا ہے، وہ صاحب رائے ہے یا نہیں۔ وغیرہ۔

اس کے مقابلہ میں موجودہ حاملین اسلام کو دیکھئے۔ ان کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے حریف کے خلاف کوئی بھی لغوبات سننے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ کوئی کمینہ آدمی اگر ان کے مفروضہ حریف کے خلاف جھوٹے مضامین شائع کرے تو اس کو روکنا تو درکنار، وہ اس کو لطف لے کر پڑھیں گے اور ان کے معتقدین اس کو ہر طرف پھیلائیں گے ——— کیسے عجیب ہیں وہ حاملینِ اسلام جو حاملینِ کفر کے اخلاقی معیار پر بھی پورے نہ اتریں۔

حد کو پار نہ کیجئے

نیتین والیا ایک ۳ سالہ بچہ ہے۔ وہ اپنے والدین (وجے پال والیا اور سونیتا) کے ساتھ شاہدرہ میں رہتا ہے۔ بچہ کو چڑیا گھر دیکھنے کا شوق تھا۔ اس کے والدین اس کو دہلی کا چڑیا گھر دکھانے کے لیے لے گیے۔ مختلف جانوروں کو دیکھتے ہوئے یہ لوگ وہاں پہونچے جہاں سفید شیر کا پنجرہ ہے۔ وہ شیر اور اس کے بچے کو دیکھنے کے لیے رکے۔ یہاں نیتین ریلنگ کے اندر داخل ہوگیا اور پنجرہ میں اپنا ہاتھ ڈال دیا۔ شیرنی (نیما) نے جھپٹ کر اس کا ہاتھ اپنے منھ میں لے لیا۔ لوگوں نے اس کو لکڑی سے مار کر ہٹایا، مگر اس دوران وہ بچے کا ہاتھ کندھے تک چبا چکی تھی۔ آپریشن کے بعد بچہ زندہ ہے مگر وہ ساری عمر کے لیے اپنے دائیں ہاتھ سے محروم ہو چکا ہے۔

ٹائمس آف انڈیا (۲۱ مارچ ۱۹۸۸) کے رپورٹر کے مطابق، بچہ کے والدین نے اس حادثہ کی ذمہ داری چڑیا گھر کے کارکنوں پر ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ اس وقت پنجرہ کے پاس کوئی چوکیدار موجود نہ تھا:

The parents claim that there were gaurds around.

اکثر لوگوں کا یہ حال ہے کہ جب ان کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آتا ہے تو وہ فوراً اپنے سے باہر کسی کو تلاش کرتے ہیں جس پر حادثہ کی ذمہ داری ڈال سکیں۔ مگر موجودہ دنیا میں اس قسم کی کوشش سراسر بے فائدہ ہے۔ یہاں حادثات سے صرف وہ شخص بچ سکتا ہے جو اپنے آپ کو قابو میں رکھے۔ جو شخص خود بے قابو ہو جائے وہ لازماً حادثہ سے دوچار ہوگا، خواہ دوسروں کو ذمہ دار ٹھہرانے کے لیے اس نے ڈکشنری کے تمام الفاظ دہرا ڈالے ہوں۔

چڑیا گھر میں خونخوار جانور کے کٹہرے سے چار فٹ کے فاصلہ پر ریلنگ (Railing) لگی ہوئی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ جانور کے مقابلہ میں آدمی کو ایک محفوظ فاصلہ پر رکھا جائے۔ اسی طرح زندگی کے ہر موڑ پر ایک ریلنگ کھڑی ہوتی ہے۔ جو شخص ریلنگ کو حد سمجھ کر وہاں ٹھہر جائے وہ محفوظ رہے گا۔ اور جو شخص ریلنگ کو پار کر جائے، وہ اپنے آپ کو حادثات سے نہیں بچا سکتا، نہ چڑیا گھر کے اندر اور نہ چڑیا گھر کے باہر۔

جوش بغیر ہوش

میکی ٹامسن (Mickey Thompson) امریکہ میں پیدا ہوا۔ اس نے کار کی ریس میں عالمی شہرت حاصل کی۔ حتیٰ کہ وہ شاہ رفتار (Speed King) کہا جانے لگا۔ مگر مارچ ۱۹۸۸ میں اس کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ بوقت وفات اس کی عمر ۵۹ سال تھی۔ میکی ٹامسن بے حد جرأت مند آدمی تھا۔ نومبر ۱۹۸۷ میں اس نے اپنے دوستوں کو لاس اینجلیز میں بتایا تھا کہ کچھ بے ہودہ لوگ اس کو ٹیلی فون پر مار ڈالنے کی دھمکی دے رہے ہیں۔ اس کے دوست ارنی الوراڈو (Ernie Alvarado) نے کہا کہ میکی نے مجھ کو بتایا تھا کہ وہ جانتا ہے کہ کون شخص اس کو قتل کرنا چاہتا ہے۔ دوست نے پوچھا کہ کیا تم نے اس کی اطلاع پولیس کو کی ہے۔ میکی نے جواب دیا: اس کی کوئی ضرورت نہیں۔

مگر میکی غلطی پر تھا۔ شروع مارچ ۱۹۸۸ کی ایک صبح کو اپنی اہم سالہ بیوی ٹروڈی (Trudy) کے ساتھ وہ بریڈبری (کیلی فورنیا) میں گھر سے اپنے آفس کے لیے جا رہا تھا کہ دو آدمی بائیسکل پر آئے اور اس پر بندوق سے حملہ کر دیا۔ ٹروڈی بابوسانہ طور پر کہتی رہی کہ ——— نہ مارو، نہ مارو (Don't shoot, don't shoot) مگر گولیوں کی بوچھار نے چند منٹ کے اندر دونوں کا خاتمہ کر دیا۔ میکی نے ۱۹۶۰ میں ۴۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے کار چلا کر پہلے امریکی کا ٹائٹل حاصل کیا تھا یہ سفر اس نے ایک خاص موٹر کار کے ذریعہ طے کیا تھا جس میں چار انجن لگے ہوئے تھے۔ ہفتہ وار ٹائم (۲۸ مارچ ۱۹۸۸) نے اس حادثہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ خطرہ کی پروا نہ کرنا جس نے میکی ٹامسن کو تیز رفتاری کا بادشاہ بنایا خود وہی اس کے لیے موت کا ذریعہ بن گیا:

The disregard for danger that marked Thompson's driving career may have led to his death in his own front yard (12).

بہادری اور بے خوفی بہت اچھی چیز ہے۔ مگر انسان بہر حال کمزور ہے، وہ مطلق بہادری یا لامحدود بے خوفی کا تحمل نہیں کر سکتا۔ اس لیے بہادری اور بے خوفی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ آدمی محتاط ہو۔ وہ حکمت اور مصلحت کا لحاظ کرنا بھی جانے۔ غیر حکیمانہ چھلانگ بھی اتنا ہی غلط ہے جتنا کہ بزدلانہ پسپائی

الٹا سفر

کسان نے ایک دانہ زمین میں ڈالا۔ وہ دانہ مٹی میں مل گیا۔ چند روز بعد ایک سرسبز پودا زمین سے نکلا۔ اس نے خاموش زبان میں اعلان کیا کہ دانہ کا خاتمہ اس کے لیے ایک نئی زندگی کا آغاز تھا۔ اس کا زمین کے نیچے جانا دوبارہ نئی شان کے ساتھ زمین پر نمایاں ہونے کی طرف پہلا قدم تھا۔ یہ خدا کا قانون ہے اور کائنات میں ہر طرف خاموش زبان میں اس قانون الٰہی کا اعلان کیا جا رہا ہے۔

کھیت سے فصل لینے کے لیے پہلے اپنے دانہ کو زمین میں دفن کرنا پڑتا ہے۔ دکان سے فائدہ حاصل کرنے کے لیے پہلے اپنے سرمایہ کو دکان میں لگا دینا پڑتا ہے۔ ایک رہائشی مکان کا مالک بننے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ پہلے اپنی اینٹوں کو بنیاد میں دفن کر دیا جائے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان جس طرح عمل کر رہے ہیں، اس کا مطلب بظاہر یہ ہے کہ وہ خدا کے اس قانون پر راضی نہیں۔ مسلمان اس قانون الٰہی کو الٹی طرف سے چلانا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ کھوئے بغیر پائیں اور دیے بغیر حاصل کریں۔ مگر مسلمانوں کو جاننا چاہیے کہ ایسا کبھی ہونے والا نہیں۔ مسلمان اپنی اس الٹی جدوجہد میں ایک صدی ضائع کر چکے ہیں۔ اگر وہ مزید ایک ہزار سال تک اپنی یہ الٹی کوشش جاری رکھیں تب بھی انھیں کچھ ملنے والا نہیں۔ جتنے محروم وہ آج ہیں، اتنے ہی محروم وہ ایک ہزار سال بعد بھی رہیں گے۔

یہی موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا اصل المیہ ہے۔ ایک لفظ میں، وہ پانے سے آغاز کرنا چاہتے ہیں، جب کہ اس دنیا میں زندگی کا راز یہ ہے کہ کھونے سے آغاز کیا جائے۔ مسلمانوں کے موجودہ شور و غل کا مطلب صرف یہ ہے کہ انھوں نے اب تک آغاز بھی نہیں کیا۔ اور جو لوگ آغاز نہ کریں، وہ اختتام پر کس طرح پہونچ سکتے ہیں۔

کسی شخص کو پورب کی طرف جانا ہو اور وہ پچھم کی طرف جانے والی ٹرین پر بیٹھ جائے تو اس کو گارڈ اور ڈرائیور کی شکایت نہیں کرنا چاہیے اگر اگلے اسٹیشن پر پہونچ کر اسے معلوم ہو کہ وہ اپنی منزل سے جتنا دور پہلے تھا، اب وہ اس سے بھی زیادہ دور ہو چکا ہے۔ اس کی نارسائی اس کی اپنی بدتدبیری کا نتیجہ ہے نہ کہ کسی اور کی سازش کا نتیجہ۔

ہر قسم کے مواقع

۲۶ فروری ۱۹۸۸ کی صبح کو دہلی کے تمام اخبارات کے پہلے صفحہ کی نمایاں سرخی یہ تھی: ہندستان کے پہلے میزائل کا کامیاب تجربہ۔ ۲۵ فروری کو پارلیمنٹ میں تالیوں کی گونج کے درمیان وزیر اعظم راجیو گاندھی نے اعلان کیا کہ ہندستان نے زمین سے زمین پر مار کرنے والا میزائل (پرتھوی) تیار کرلیا ہے اور اس کا کامیاب تجربہ بھی کیا جا چکا ہے۔ یہ میزائل مکمل طور پر ہندستانی ٹکنالوجی سے تیار کیا گیا ہے۔ وہ خالص دفاعی نوعیت کا ہے اور اس کا رینج ۲۵۰ کیلو میٹر ہے۔ اس طرح اب ہندستان ان چار ملکوں (امریکہ، روس، فرانس، چین) میں شامل ہوگیا ہے جو خشکی پر مار کرنے والے میزائل بنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اس میزائل کے بارہ میں جو خبریں آئی ہیں، ان میں سے ایک خبر ہندستان ٹائمس (۲۶ فروری ۱۹۸۸) کے مطابق یہ ہے کہ پرتھوی میزائل حیدرآباد کے دفاعی تحقیقی ادارہ (DRDO) کی لیبارٹری میں تیار کیا گیا ہے۔ یہ کام سائنس دانوں کی ایک ٹیم نے انجام دیا ہے جو ڈاکٹر ابوالکلام کی ماتحتی میں کام کر رہی تھی:

The 'Prithvi' missile was fabricated at the Defence Research and Development Laboratory at Hyderabad under a team of scientists headed by Dr Abul Kalam.

دفاعی ریسرچ کا کام بے حد نازک کام ہے۔ اس شعبہ میں کام کرنے کے لیے ایسے افراد کا انتخاب کیا جاتا ہے جو بیک وقت دو صلاحیتیں رکھتے ہوں۔ اعلیٰ فنی مہارت، اور قابل اعتماد شخصیت۔ اس قسم کے ایک ممتاز عہدہ کے لیے "ڈاکٹر ابوالکلام" کا انتخاب بہت بڑا سبق دیتا ہے۔ یہ واقعہ بتاتا ہے کہ ہندستان میں مسلمانوں کے لیے ہر قسم کی ترقی کے مواقع پوری طرح کھلے ہوئے ہیں۔ اگر وہ اپنے اندر لیاقت پیدا کریں تو وہ ملک کے انتہائی اعلیٰ شعبوں میں بھی اونچے مناصب حاصل کر سکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں اصل قیمت لیاقت کی ہے۔ لیاقت کا ثبوت دینے کے بعد آدمی ہر جگہ عزت پالیتا ہے اور لیاقت کا ثبوت نہ دینے کی صورت میں ہر جگہ بے عزت ہو کر رہ جاتا ہے۔

مقصد کی اہمیت

ضلع حسن (کرناٹک) میں ایک گاؤں ہے جس کا نام تھپر گھٹہ ہے۔ یہاں ایک شخص لچھ نائک نامی تھا جو ایک جھونپڑے میں رہتا تھا، اور چوکیداری کا کام کرتا تھا۔ اس کے چار بچے تھے۔ اس نے طے کیا کہ وہ اپنی تین لڑکیوں کو دیوی چمنڈیشوری پر بھینٹ چڑھا دے۔ ۲۳ اپریل ۱۹۸۸ کو وہ دیوی کی مورت لے کر آیا۔ اس کی پوجا کی اور اس کے بعد اپنی تین لڑکیوں (ڈیڑھ سال، تین سال، تیرہ سال) کو درانتی سے ذبح کر دیا۔ اس کے لڑکے راج کمار (۸ سال) نے مزاحمت کرنی چاہی تو اس پر بھی حملہ کر دیا جس کے نتیجہ میں اس کا دایاں ہاتھ کٹ گیا۔ اس مجنونانہ حرکت کے بعد وہ بھاگ کر باہر چلا گیا۔ چار دن بعد اس کی لاش آم کے ایک اکیلے درخت سے لٹکی ہوئی پائی گئی۔

مذکورہ خبطی کی بیوی للی تھمّا (۳۵ سال) کو چیف منسٹر ریلیف فنڈ سے ۵ ہزار روپیہ دیا گیا ہے۔ انڈین ریڈ کراس سوسائٹی نے اس کو ایک ہزار روپیہ دیا ہے۔ اب وہ اپنے لڑکے کے مستقبل کے بارہ میں منصوبہ بنا رہی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اس کے بچے کو تعلیم حاصل کرنا چاہیے۔ وہ اس کے لیے تیار ہے کہ بیٹے کی تعلیم کے لیے اگر اس کو ساری زندگی کام کرنا پڑے تو وہ ساری زندگی اس کے لیے کام کرے گی۔ اس کو بیوہ کی حیثیت سے ۵۰ روپیہ ماہوار پنشن ملنے کی امید ہے۔ تقریباً اتنی ہی ماہانہ رقم اس کے بیٹے کو معذوری کے وظیفہ کے طور پر ملے گی۔ راج کمار جس کے دائیں ہاتھ کی پانچوں انگلیاں کٹ چکی ہیں، اب اپنے بائیں ہاتھ سے لکھنا سیکھ رہا ہے (ٹائمس آف انڈیا ۲۸ اپریل ۱۹۸۸)

للی تھمّا کا سب کچھ لٹ چکا تھا۔ اب بظاہر یہ ہونا چاہیے تھا کہ وہ بھی خودکشی کر لے، یا اپنے بیٹے کو لے کر رونے اور ماتم کرنے میں مشغول ہو جائے۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے سب کچھ بھلا کر مثبت عمل کا منصوبہ بنایا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اپنے معذور بیٹے کے مستقبل کی تعمیر کی صورت میں اس نے اپنے لیے ایک مقصد پا لیا۔

بامقصد آدمی کبھی محروم نہیں ہوتا، اس دنیا میں محروم وہ ہے جو مقصد سے محروم ہو جائے۔

پیغمبرانہ طریقہ

سیرت کی کتابوں میں جن واقعات کا ذکر ہے، ان میں سے ایک وہ ہے جس کو حلف الفضول کہا جاتا ہے۔ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب کہ آپ کو ابھی پیغمبری نہیں ملی تھی۔ مکہ میں عبداللہ بن جُدعان کے مکان میں کچھ لوگ جمع ہوئے۔ انھوں نے مل کر یہ عہد کیا کہ وہ مظلوم کی حمایت کریں گے اور حقدار کو اس کا حق دلائیں گے۔ جو افراد اس اجتماع میں شریک ہوئے، ان میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم بھی تھے۔ ابن اسحاق کی روایت ہے کہ پیغمبری کے بعد مذکورہ اجتماع (حلف الفضول) کا ذکر ہوا تو آپ نے فرمایا کہ اس وقت میں بھی اس میں شریک تھا۔ اور اب اسلام کے بعد بھی اگر مجھے اس کے لیے بلایا جائے تو میں لبیک کہوں گا (وَلَوْ اُدْعَیَ بِہٖ فِی الْاِسْلَامِ لَاَجَبْتُ، سیرۃ ابن ہشام، الجزء الاول، صفحہ ۱۴۵)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد حلف الفضول والے کام کے بارے میں تھا۔ دوسری طرف دعوت توحید کے بارہ میں آپ نے فرمایا کہ یہ میرا راستہ ہے۔ میں لوگوں کو پوری بصیرت کے ساتھ اللہ کی طرف بلاتا ہوں، میں اور میری پیروی کرنے والے بھی (ھٰذہٖ سبیلی ادعو الی اللہ علیٰ بصیرۃ انا ومن اتبعنی، یوسف ۱۰۸)

ان دونوں باتوں پر تقابلی اعتبار سے غور کیجئے۔ اس سے واضح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ "حلف الفضول" والے کام میں آپ صرف مدعو کی حیثیت اپنے لیے پسند فرماتے تھے۔ جب کہ "دعوت توحید" والے کام میں آپ داعی کی حیثیت اختیار کیے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا کہ ایسا ماحول جہاں شرک کا غلبہ ہو، وہاں دعوت توحید ہی اہل ایمان کا اصل ایجابی کام ہوگا۔ وہ داعی الی اللہ بن کر اٹھیں گے۔ جہاں تک سماجی امن اور اخلاقی سدھار کی بات ہے، اس میں وہ خیر طلب عناصر کے بلاوے پر وقتی طور پر ان کے ساتھ شریک ہو سکتے ہیں، مگر اسی کو اپنی دعوت و تحریک کی بنیاد نہیں بنا سکتے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی بگاڑ کی اصل جڑ ہمیشہ خدا فراموشی ہوتی ہے، اور پیغمبر اور اس کی اتباع میں اہل ایمان ہمیشہ جڑ پر محنت کرتے ہیں نہ کہ شاخوں اور پتیوں پر۔

اصحاب رسول

ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے اصحاب کو برا نہ کہو۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اگر تم میں سے کوئی شخص احد پہاڑ کے برابر سونا صدقہ کرے تو وہ ان کے ایک مُد یا اس کے نصف کے صدقہ کے برابر بھی نہیں پہونچے گا (لا تسبوا اصحابی فوالذی نفسی بیدہ لو ان احدکم انفق مثل احد ذھبا ما بلغ مدّ احدھم ولا نصیفہ، متفق علیہ)

اصحاب رسول کی یہ عظمت کسی پُراسرار تقدس کی بنا پر نہیں ہے، اس کی ایک معلوم اور معقول وجہ ہے، اور وہ وہی ہے جو قرآن میں واضح طور پر بتائی گئی ہے۔ یہ وجہ ہے "فتح" سے پہلے ایمان لانا اور قربانیاں دینا۔ (الحدید ۱۰)

غلبہ اور فتح سے پہلے رسول کی حیثیت بس ایک عام انسان کی تھی۔ اس وقت تک آپ کی حیثیتِ رسالت ثابت شدہ نہیں بنی تھی، وہ تاریخی طور پر معتبر اور مسلّم نہیں ہوئی تھی۔ اس وقت رسول کو پہچاننے اور اس پر فدا ہونے کے لیے وہ خاص نظر درکار تھی جو کسی چیز کو محض جوہر کی سطح پر پہچان لیتی ہے۔ اس وقت آپ کا ساتھ دینے کے لیے وہ انوکھا حوصلہ درکار تھا جو ایسے وقت میں ایک صاحب حق کا ساتھ دے جس کا ساتھ دینا پورے سماج میں نکّو بن جانے کے ہم معنی ہو۔ جو اس وقت قربانی پیش کرے جب کہ قربانی پیش کرنے کا کوئی کریڈٹ اس کو نہ مل رہا ہو۔

سورہ ہود میں ہے کہ پیغمبر کا انکار کرنے والوں نے کہا کہ ہم تمہارے اندر کوئی "فضل" نہیں دیکھتے۔ پیغمبر نے جواب دیا، کیا تم کو "بیّنہ" دکھائی نہیں دیتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیا چیز ہے جو ہر دور میں داعیان حق کو پہچاننے میں رکاوٹ بنتی رہی ہے۔ وہ یہ کہ لوگ اپنی ظاہر بینی کی وجہ سے داعی حق کو دنیوی بڑائی کی زمین پر دیکھنا چاہتے ہیں، جب کہ حق کا داعی ہمیشہ دلیل کی زمین پر کھڑا ہوتا ہے۔ صحابہ تاریخ کے وہ نادر گروہ ہیں جنھوں نے پیغمبر کو اس وقت پہچانا جب کہ اس کی صداقت کو ثابت کرنے کے لیے نظری دلیل کے سوا اور کوئی چیز موجود نہ تھی۔ ان کی یہی امتیازی صفت ہے جس نے ان کو تاریخ میں امتیازی درجہ دے دیا۔

حقیقی شخصیت

حضرت عمر فاروق سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عمل کا دار و مدار نیت پر ہے۔ اور ہر آدمی کے لیے وہی ہے جس کی اس نے نیت کی۔ پس جس شخص کی ہجرت اللہ اور رسول کی طرف ہو، تو اس کی ہجرت اللہ اور رسول کے لیے ہے۔ اور جس شخص کی ہجرت دنیا حاصل کرنے کے لیے ہو، یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لیے ہو تو اس کی ہجرت اسی چیز کے لیے ہے جس کی طرف اس نے ہجرت کی۔

ایک شخص ہجرت کے سفر پر مکہ سے مدینہ کے لیے روانہ ہوتا ہے۔ بظاہر اس کا جسم ایک مقدس سفر میں ہے۔ مگر اس کا ذہن ایک اور خیال میں لگا ہوا ہے۔ وہ سوچ رہا ہے کہ اس کو مدینہ پہونچ کر فلاں دنیوی فائدہ حاصل کرنا ہے۔ ایسے شخص نے اپنے ظاہر کے اعتبار سے ہجرت کی، مگر اس نے اندر کے اعتبار سے ہجرت نہیں کی۔ اس کا جسم تو مہاجر ہے، مگر اس کی روح بدستور غیر مہاجر۔

ایسا شخص آخرت میں اپنے جسم کے اعتبار سے نہیں اٹھے گا، بلکہ اپنی روح کے اعتبار سے اٹھے گا۔ اس کے ساتھ اس کی اندرونی حقیقت کے مطابق معاملہ کیا جائے گا نہ کہ اس کے ظاہری حلیہ کے مطابق۔ اس کی ظاہری شخصیت اسی موجودہ دنیا میں رہ جائے گی، آخرت میں اس کی صرف وہ شخصیت پہونچے گی جو اس نے داخلی طور پر اپنے جسم کے اندر بنائی تھی۔

موجودہ دنیا میں ہر آدمی ایک قسم کا مکھوٹا (Mask) لگائے ہوئے ہے۔ کوئی مہاجر کا مکھوٹا، کوئی مجاہد کا مکھوٹا، کوئی اور دینی مکھوٹا۔ اس قسم کے مکھوٹوں سے انسان دھوکا کھا سکتے ہیں، مگر خدا ان سے دھوکا کھانے والا نہیں۔ آخرت میں خدا ہر ایک کا مکھوٹا اس کے چہرے سے اتار دے گا۔ اس وقت لوگ دیکھیں گے کہ وہ شخص جو بظاہر علمبردار اسلام کا مکھوٹا لگائے ہوئے تھا، وہ اندر سے صرف علم بردار مفاد تھا اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

جو شخص اندرونی طور پر کچھ اور ہو، اور بیرونی طور پر اپنے آپ کو کچھ اور بنا کر پیش کرے، وہ خدا کو دھوکا دے رہا ہے، ایسا آدمی آخرت میں فریب کار کی حیثیت سے اٹھایا جائے گا نہ کہ دیندار کی حیثیت سے۔

اعتراف

فتح مکہ کے بعد جب عرب پر اسلام کا غلبہ قائم ہوگیا اور اکثر قبائل اسلام میں داخل ہوگیے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتوں کے خاتمہ کی مہم شروع کی۔ اس سلسلہ میں ایک مہم وہ تھی جو سُواع کی طرف سے بھیجی گئی۔

ہُذیل بن مُدرکہ بن الیاس بن مُضر نے زمانۂ جاہلیت میں ایک بت بنایا تھا جو سُواع کہا جاتا تھا، اس بت کو انھوں نے رِیاط (ینبوع) میں رکھا تھا۔ رمضان ۸ھ میں حضرت عمرو بن العاص سواع کو منہدم کرنے کے لیے بھیجے گیے۔

یہ مقام مکہ سے تین میل کے فاصلہ پر تھا۔ عَمرو بن العاصؓ جب وہاں پہنچے تو اس بت کے مجاور نے ان سے پوچھا کہ تم کس ارادہ سے یہاں آئے ہو۔ عمرو بن العاص نے جواب دیا کہ میں خدا کے رسول کے حکم سے یہاں آیا ہوں تاکہ اس بُت کو منہدم کر دوں۔ مجاور کے ذہن پر سواع کی عظمت اتنی زیادہ چھائی ہوئی تھی کہ اس نے کہا کہ تم کبھی ایسا نہ کرسکو گے۔ سواع تم کو ضرور اس سے روک دے گا۔ عمرو بن العاص نے کہا کہ افسوس ہے تمہارے اوپر، تم اب تک اسی وہم میں پڑے ہوئے ہو۔ کیا یہ بت سنتا ہے اور دیکھتا ہے جو وہ مجھ کو روک دے گا۔ یہ کہہ کر انھوں نے سواع پر ایک ضرب لگائی اور بت ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔

یہ منظر مجاور کے لیے بالکل خلاف توقع تھا۔ بت کے ٹوٹنے کے ساتھ اس کے خیالات کا طلسم بھی ٹوٹ گیا۔ وہ پکار اٹھا: اَسْلَمتُ لِلّٰہ۔ اور اسی وقت شرک کو چھوڑ کر دینِ توحید (اسلام) میں داخل ہوگیا۔

حق کو نہ ماننے والے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو تعصب اور نفسانیت کی وجہ سے حق کو نہ مانیں۔ دوسرے وہ جو غلط فہمی کی وجہ سے حق کو نہ مانیں۔ پہلی قسم کے لوگوں کو کبھی حق کا اعتراف کرنے کی توفیق نہیں ملتی۔ مگر دوسری قسم کے لوگوں کا نہ ماننا وقتی ہوتا ہے۔ وہ نہ سمجھنے کی وجہ سے انکار کر رہے تھے، اس لیے جب بات کو دلیل سے واضح کر دیا جائے تو وہ فوراً حق کو پا لیتے ہیں اور اپنی پچھلی روش کو چھوڑ کر اس کے آگے جھک جاتے ہیں۔

دنیا سے آخرت لینا

قرآن میں قارون کا قصہ بیان ہوا ہے۔ ارشاد ہوا ہے کہ وہ حضرت موسیٰ کی قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ پھر فرعون سے مل کر اس نے کافی دولت کمائی۔ اس کے خزانوں کا یہ حال تھا کہ "ان کی کنجیاں طاقت ور آدمیوں کی ایک جماعت مشکل سے اٹھا سکتی۔ اس دولت سے قارون کے اندر فخر اور گھمنڈ پیدا ہو گیا۔ اس وقت کچھ صالح بندوں نے اس کو نصیحت کی کہ دولت پر فخر نہ کر۔ اللہ نے تجھ کو جو کچھ دیا ہے اس سے آخرت کا طالب بن اور دنیا سے اپنا حصہ نہ بھول (وابتغ فيما آتاك الله الدار الآخرة ولا تنس نصيبك من الدنيا، القصص ۷۷)

اس کی تفسیر کے سلسلہ میں مفسرین کے کچھ اقوال یہ ہیں:

وقيل معناه واطلب بدنياك آخرتك فان ذلك حظ المومن منها (تفسیر النسفی)

اور کہا گیا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی دنیا کے ذریعہ آخرت چاہو۔ کیونکہ یہی اس سے مومن کا حصہ ہے۔

يعني ما تحصل بها آخرتك فان حقيقة نصيب الانسان من الدنيا ان يعمل للآخرة فان الدنيا مزرعة الآخرة۔ كذا قال مجاهد وابن زيد۔ وقال السدي نصيبك من الدنيا الصدقة وصلة الرحم وقال علي رضي الله عنه لا تنس صحتك وقوتك وشبابك وغناك ان تطلب الآخرة۔ فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم اغتنم خمسا قبل خمس، حياتك قبل موتك وصحتك قبل سقمك وفراغك

یعنی دنیا سے وہ چیز لینا نہ بھولو جس سے تم اپنی آخرت حاصل کر سکو۔ دنیا سے انسان کا اصل حصہ یہ ہے کہ وہ آخرت کے لیے عمل کرے۔ کیوں کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ مجاہد اور ابن زید کا قول یہی ہے۔ اور سدی نے کہا کہ دنیا سے تمہارا حصہ صدقہ اور صلہ رحمی ہے۔ اور علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تم اپنی صحت اور اپنی قوت اور اپنی جوانی اور اپنی دولت کے معاملہ میں یہ نہ بھولو کہ تم اس کے ذریعہ سے آخرت چاہو۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پانچ چیز

قبل شغلك وشبابك قبل هرمك و غناك قبل فقرك ـ وقال الحسن امر ان يقدم الفضل ويمسك ما يغنيه يعنی ما يكفيه ـ
(التفسير المظہری)

سے پہلے پانچ چیز کو غنیمت جانو۔ اپنی موت سے پہلے اپنی زندگی کو۔ اپنی بیماری سے پہلے اپنی صحت کو۔ اپنی مشغولیت سے پہلے اپنی فراغت کو۔ اپنے بڑھاپے سے پہلے اپنی جوانی کو۔ اور اپنی محتاجی سے پہلے اپنی دولت مندی کو۔ اور حسن بصری نے کہا کہ یہاں یہ حکم دیا گیا ہے کہ حقیقی ضرورت کے بقدر مال روک کر ضرورت سے زیادہ کو آگے بھیجو ۔

موجودہ دنیا جو انسان کو دی گئی ہے، وہ آخرت کی کمائی کرنے کے لیے دی گئی ہے۔ جس شخص نے دنیا میں آخرت کے فائدہ والا کام کیا، اس نے دنیا سے آخرت کا حصہ لیا۔ اس کے برعکس جو شخص دنیا میں صرف دنیا کے فائدہ والا کام کرتا رہا۔ اس نے دنیا سے آخرت کا حصہ نہیں لیا۔ وہ موت کے بعد دوسری دنیا میں اس طرح پہونچے گا کہ وہاں اس کے لیے کچھ نہ ہوگا۔

یہ انجام صرف عام دنیا داروں کا نہیں ہوگا۔ یہی انجام ان لوگوں کا بھی ہوگا جو بظاہر دین والے کام کرتے ہیں۔ مگر اس سے ان کا مقصد دنیوی فائدہ حاصل کرنا ہوتا ہے۔ دین کا کام کرکے اگر کوئی شخص مال، قیادت، شہرت، عزت، بڑائی چاہے تو اس نے بھی گویا دنیا سے اپنی آخرت کا حصہ نہیں لیا۔ وہ بھی آخرت میں اتنا ہی نامراد ہوگا جتنا بدنام قسم کے دنیا دار، بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ ۔

خاتونِ اسلام (نیا ایڈیشن)

خاتونِ اسلام کا پہلا ایڈیشن غیر معمولی طور پر مقبول ہوا اور بہت جلد ختم ہوگیا۔ اب اس کا دوسرا ایڈیشن چھپ کر تیار ہے۔ دوسرے ایڈیشن میں تقریباً ۱۰ صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے۔ مزید معلومات کے لیے دفتر سے رابطہ قائم فرمائیں۔ منیجر مکتبہ الرسالہ

مومنانہ طریقہ

ابن عبدالبر اندلسی (م ۴۶۳ھ) نے ایک واقعہ ان الفاظ میں نقل کیا ہے :

رویـنا ان طاؤسا و وهب بن منبه التقیا۔ فقال طاؤس لوهب یا اباعبدالله، بلغنی عنك امر عظیم۔ فقال ماهو۔ قال تقول ان الله حمل قوم لوط بعضهم علی بعض۔ قال اعوذ بالله۔ ثم سكتا۔ قال فقلت هل اختصما، قال لا۔

(جامع بیان العلم وفضلہ، الجزءالثانی، صفحہ ۹۵)

ہم سے بیان کیا گیا ہے کہ طاؤس اور وہب بن منبہ ایک دوسرے سے ملے۔ طاؤس نے وہب سے کہا کہ اے ابوعبداللہ، آپ کے بارہ میں مجھے ایک سنگین بات پہنچی ہے۔ انھوں نے پوچھا کہ وہ کیا طاؤس نے کہا یہ کہ آپ کہتے ہیں کہ اللہ ہی نے تو قوم لوط کے بعض کو بعض کے اوپر چڑھایا۔ وہب بن منبہ نے کہا کہ اللہ کی پناہ۔ پھر دونوں چپ ہو گیے۔ میں نے راوی سے پوچھا، کیا دونوں میں بحث ہوئی۔ راوی نے جواب دیا کہ نہیں۔

سوال دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک سچا سوال، دوسرے جھوٹا سوال۔ سچا سوال کرنے والا واقعی سائل ہوتا ہے۔ وہ ایک بات کی حقیقت جاننا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے آدمی کو چپ کرنا آسان ہے۔ اس کو اپنے سوال کا جواب مطلوب تھا، اور جب اس کو اپنے سوال کا جواب مل گیا تو وہ خاموش ہو گیا۔

جھوٹے سائل کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ اس کا مقصد حقیقت کو جاننا نہیں ہوتا بلکہ شخصِ ثانی کو غلط ثابت کرنا ہوتا ہے۔ اگر وہ اپنے سوال کا جواب پاکر چپ ہو جائے تو اس کا اصل مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ ہر جواب کے بعد نئے شوشے نکال لیتا ہے ——— کبھی غیر متعلق باتیں چھیڑتا ہے۔ کبھی دلیل سے ہٹ کر عیب جوئی کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ کبھی تلخ کلامی سے مخاطب کو زیر کرنا چاہتا ہے۔ کبھی دھاندلی اور تمسخر کا انداز اختیار کرتا ہے۔

جو لوگ اس طرح دوسرے کو غلط ثابت کرنا چاہیں، وہ خود اپنے آپ کو غلط ثابت کرتے ہیں نہ کہ کسی دوسرے شخص کو۔

برا فیصلہ

قرآن میں مشرکین کے بارہ میں کہا گیا ہے کہ اللہ نے جو کھیتی اور چوپائے پیدا کیے ہیں، ان میں سے انھوں نے اللہ کا کچھ حصہ مقرر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ حصہ اللہ کا ہے، ان کے گمان کے مطابق، اور یہ حصہ ہمارے شریکوں کا ہے۔ پھر جو حصہ ان کے شریکوں کا ہوتا ہے وہ تو اللہ کو نہیں پہونچتا اور جو حصہ اللہ کے لیے ہے وہ ان کے شریکوں کو پہونچ جاتا ہے۔ کیسا برا فیصلہ ہے جو یہ لوگ کرتے ہیں (الانعام ۱۳۷)

آدمی زبان سے کہتا ہے کہ میں اللہ کو مانتا ہوں۔ مگر اس کے دل میں حقیقی اہمیت اور عظمت دوسری چیزوں کی بیٹھی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ اللہ اور غیر اللہ میں ٹکراؤ پیش آتا ہے۔

قدیم عرب کے مشرکین بظاہر اللہ کا اقرار کرتے تھے، مگر ان کے دلوں میں سب سے زیادہ بڑائی اپنے بتوں کی بیٹھی ہوئی تھی۔ چنانچہ وہ ایسا کرتے تھے کہ مویشی یا پیداوار یا نذر و نیاز کی تقسیم میں کچھ حصہ خدا کا نکالتے اور کچھ حصہ بتوں کا۔ اس تقسیم میں اگر کسی وجہ سے خدا کی طرف زیادہ آجاتا اور بتوں کی طرف کم تو اس کو لے کر فوراً بتوں کی طرف ڈال دیتے۔ لیکن اگر معاملہ اس کے برعکس ہو۔ یعنی خدا کا حصہ گھٹ جائے اور بتوں کا حصہ بڑھ جائے۔ تو وہ ایسا نہ کرتے کہ بتوں کی طرف سے نکال کر اس کو خدا کے حصہ میں ڈالیں۔

یہ صرف قدیم مشرکوں کا قصہ نہیں، یہی معاملہ ہر شخص کے ساتھ پیش آتا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ قدیم مشرکین یہ معاملہ پتھروں کے ساتھ کرتے تھے، آج کا انسان یہی معاملہ دوسرے دوسرے "بتوں" کے ساتھ کرتا ہے۔

آج کے انسان کا یہ حال ہے کہ دیانت داری اور دنیوی مفاد میں ٹکراؤ ہو تو وہ دیانت داری کو دنیوی مفاد کے خانہ میں ڈال دیتا ہے۔ وہ ایسا نہیں کرتا کہ دنیوی مفاد کو دیانت داری کے خانہ میں ڈالے۔ اس کی وجہ دوبارہ ان کا وہی "برا فیصلہ" ہے جو پہلی صورت میں تھا۔ وہ خدا کے حق میں کمی سے بے خوف ہیں۔ اور غیر خدا کے حق میں کمی کرنے سے ڈرتے ہیں کہ وہ ہلاک ہو جائیں گے۔

امتحان

احد کی جنگ (۳ھ) میں اہل ایمان کو سخت نقصان اٹھانا پڑا۔ ۷۰ مسلمان شہید ہو گئے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شدید زخم آئے۔ ان واقعات پر مدینہ کے مسلمان غم زدہ تھے۔ قرآن میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا گیا کہ دو جماعتوں کی مڈبھیڑ کے وقت تم کو جو مصیبت پیش آئی وہ اللہ کے حکم سے تھی۔ اور اس لیے تھی تاکہ اللہ ایمان والوں کو جان لے اور تاکہ وہ ان لوگوں کو جان لے جو منافق ہیں (آل عمران ۱۶۷ - ۱۶۶)

یہ اللہ تعالیٰ کی ایک خاص سنت ہے جو مختلف الفاظ میں مختلف مقامات پر بیان ہوئی ہے۔ سورہ نمبر ۵۷ میں مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ کوئی بھی مصیبت جو آتی ہے، خواہ وہ جس صورت میں بھی آئے، وہ پہلے سے کتاب خداوندی میں لکھی ہوئی ہے (الحدید ۲۲) اس سلسلہ میں آگے ارشاد ہوا ہے کہ ـــــ اور تاکہ اللہ معلوم کرے کہ کون مدد کرتا ہے اس کی اور اس کے رسول کی بن دیکھے (ولیعلم اللہ من ینصرہ ورسلہ بالغیب ـــــ، الحدید ۲۵)

احد کا حادثہ اسی قسم کا ایک امتحان تھا۔ مدینہ کے مسلمانوں میں دو قسم کے لوگ تھے۔ ایک طاقتور ایمان والے، دوسرے کمزور ایمان والے۔ طاقتور ایمان والے "غیب" کی سطح پر سچائی کو پائے ہوئے تھے۔ وہ چیزوں کو حق اور ناحق کی روشنی میں دیکھتے تھے نہ کہ ظاہری فتح اور شکست کی روشنی میں۔

کمزور ایمان والے معاملات کو صرف ظاہری سطح پر دیکھنے والی نگاہ رکھتے تھے۔ چنانچہ اُحد کے حادثہ کے بعد وہ مسلمانوں کو حقیر سمجھنے لگے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی دعوت کی صداقت پر شک کرنے لگے۔ انھوں نے اپنی روش سے یہ ثابت کیا کہ وہ صرف اس حق کے ساتھی ہیں جو انھیں ساحل پر مل جائے۔ جس حق کی خاطر دریا کی موجوں کے تھپیڑے کھانے پڑیں، اس سے انھیں کوئی دل چسپی نہیں۔

اس دنیا میں حق کو "غیب" کی سطح پر پانا پڑتا ہے۔ جو لوگ حق کو "شہود" کی سطح پر پانا چاہیں، وہ حق کو پانے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

کتمانِ شہادت

قدیم عرب میں یہود بڑی تعداد میں آباد تھے۔ ماضی کی روایات کی بنا پر ان کو اپنے ماحول میں سرداری حاصل تھی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جب قرآن اور اسلام کی دعوت پیش کی تو یہود آپ کے مخالف ہوگیے۔ انھوں نے یہ ثابت کرنا شروع کیا کہ ہم دین پر ہیں اور محمد دین سے دور ہوگیے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہود کے نزدیک دین نام تھا دینِ اکابر کا۔ اس کے برعکس رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم دینِ خدا کو دین کی حیثیت سے پیش کرتے تھے۔ اس فرق کی بنا پر وہ لوگ آپ کے دشمن ہوگیے۔

تاہم یہ دشمنی ظاہری تھی۔ یہود اپنے علم کے مطابق اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کے اکابر اس دنیا کے خدا نہیں ہیں بلکہ خدا اس دنیا کا خدا ہے۔ سچا دین وہی ہے جو آدمی کو خدا سے جوڑے نہ کہ وہ جو آدمی کو انسانی اکابر سے وابستہ کرے۔ یہود کا دل رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پیغام کی صداقت پر گواہی دیتا تھا مگر دنیا کے فائدے اور قیادت کی مصلحتیں انھیں روکتی تھیں کہ وہ اپنے دل کی بات کو زبان پر لائیں۔ وہ سچائی کو سچائی جانتے ہوئے اس کے اعلان و اظہار سے باز رہے۔ یہود کی اس مجرمانہ خاموشی پر تنبیہہ کرتے ہوئے قرآن میں کہا گیا ہے :

ومن اظلم ممن کتم شهادة عنده من الله (البقرہ ۱۴۰)	اور اس سے بڑا ظالم اور کون ہوگا جو اس گواہی کو چھپائے جو اللہ کی طرف سے اس کے پاس ہے۔

جب آدمی کا دل ایک بات کی سچائی کا اقرار کرے تو گویا اس کے پاس خدا کی گواہی آگئی۔ یہ گواہی خدا کی ایک مقدس امانت ہے۔ آدمی کے اوپر لازم ہے کہ وہ اس گواہی کا اعلان کرے۔ جو شخص اس خدائی گواہی کے لیے نہ اٹھے وہ ظالم ہے، ایسے ظالموں سے خدا کبھی راضی نہیں ہوسکتا۔ وہ خدا کے معاملہ میں غیر جانب دار ہوگیے، اس لیے خدا بھی ان کے معاملہ میں غیر جانب دار ہو جائے گا، اور جس کے معاملہ میں خدا غیر جانبدار ہو جائے اس کا زمین و آسمان میں کوئی ٹھکانا نہیں۔

سچائی موجودہ دنیا میں خدا کی نمائندہ ہے۔ جو لوگ سچائی کا ساتھ نہ دیں، انھوں نے خدا کا ساتھ نہیں دیا، انھوں نے خدا کو نظر انداز کر دیا۔

شعور اور عمل

قرآن میں بنی اسرائیل کے بارہ میں بتایا گیا ہے کہ انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ ہم کو جنگ کا حکم دیجئے۔ مگر جب ان کو جنگ کا حکم دیا گیا تو تھوڑے لوگوں کو چھوڑ کر ان کی اکثریت جنگ کرنے کے لیے تیار نہ ہوئی (البقرہ ۲۴۶)

اس کے برعکس پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کے بارہ میں ارشاد ہوا ہے کہ جب ان کو جنگ کا سامنا ہوا اور ان سے لڑنے کے لیے کہا گیا تو وہ فوراً مقابلہ کے لیے تیار ہو گیے۔ انھوں نے کہا کہ یہ تو وہی چیز ہے جس کا خدا اور رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا (الاحزاب ۲۲)

اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کے ساتھ جو لوگ تھے وہ پیدائشی مومن تھے۔ جب کہ پیغمبر اسلامؐ کا ساتھ دینے والے وہ لوگ تھے جو شعوری انقلاب کے بعد مومن بنے تھے۔ یہی وہ فرق ہے جس نے دونوں کے کردار میں اتنا بڑا فرق پیدا کر دیا۔ عمل کا معاملہ لازمی طور پر شعور کے ساتھ وابستہ ہے۔ آدمی کا شعور جتنا گہرا ہوگا اس کا عمل بھی اُتنا ہی گہرا ہوگا۔ اور اس کا شعور جتنا سطحی ہوگا اس کے عمل میں بھی اتنی ہی سطحیت آتی چلی جائے گی۔

اس فرق کو دوسرے لفظوں میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ عمل کے لیے صرف حکم کافی نہیں۔ کسی حکم کو قبول کرنے کے لیے اسی درجہ کا شعور بھی لازمی طور پر درکار ہے۔ جس شخص کو حکم دیا جا رہا ہے، اس کا شعوری ارتقاء اگر حکم سے کم تر درجہ کا ہو تو وہ حکم کی معنویت کو پوری طرح سمجھ نہ سکے گا۔ وہ اس کو اپنے دماغ میں وہ اہمیت دینے سے قاصر رہے گا جو باعتبار حقیقت اسے دینا چاہیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ نفسیاتی طور پر اس کی تعمیل کے لیے بھی تیار نہ ہو سکے گا۔

ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ ابتدائی دور میں جو لوگ ایمان قبول کرتے ہیں وہ شعور اور ارادہ کے تحت ایمان قبول کرتے ہیں ان کی بعد کی نسلوں میں یہ شعور مدھم پڑ جاتا ہے یا ختم ہو جاتا ہے۔ اب ضرورت ہوتی ہے کہ دوبارہ ان کے شعور کو جگایا جائے، ان کے تقلیدی ایمان کو ارادی فیصلہ کے تحت اختیار کرنے والا ایمان بنا دیا جائے ——— موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی اصلاح کا پہلا قدم یہی ہے کہ ان کے اندر شعوری ایمان کو جگانے کی کوشش جائے۔

لفظ یا حقیقت

رابندر ناتھ ٹیگور (۱۹۴۱- ۱۸۶۱) کو حکومت برطانیہ نے ۱۹۱۵ میں سر کا خطاب دیا تھا۔ ۱۹۱۹ میں جب انگریزی حکومت نے امرت سر میں نہتے ہندستانیوں پر بے رحمانہ گولی چلوائی تو ٹیگور نے سر کا خطاب واپس کر دیا۔

ڈاکٹر محمد اقبال (۱۹۳۸- ۱۸۷۷) کو حکومت برطانیہ نے ۱۹۲۲ میں سر کا خطاب عطا کیا۔ اقبال نے اس کو قبول کر لیا اور پھر کبھی اس کو واپس نہیں کیا۔

راقم الحروف ذاتی طور پر سر کا خطاب لینے کو غلط نہیں سمجھتا۔ مگر اقبال نے اپنی شاعری میں جس قسم کی باتیں کیں، اس کے لحاظ سے انگریزی حکومت کا دیا ہوا سر کا خطاب ان کے لیے بالکل غیر مناسب تھا۔ مثال کے طور پر ان کا شعر ہے:

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

اقبال کے اپنے معیار کے مطابق، سر کا خطاب قصرِ سلطانی کے گنبد پر نشیمن بنانے کے ہم معنی تھا، مگر دوسروں کو تو وہ اس قسم کی نشیمن سازی سے باز رہنے کا اُپدیش دیتے رہے۔ لیکن خود ان کا اپنا حال یہ تھا کہ وہ آخر وقت تک قصرِ سلطانی کے گنبد پر اپنا نشیمن بنائے رہے۔

یہ ایک مثال ہے جو بتاتی ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے درمیان جو رہنما اٹھے ان کا حال کیا تھا۔ موجودہ زمانہ کے تقریباً تمام مسلم رہنما اصلاً یا تو شاعر تھے، مثلاً اقبال۔ یا خطیب تھے، مثلاً محمد علی۔ یا انشا پرداز تھے، مثلاً ابوالاعلیٰ مودودی۔ وہ مفکر اور بالغ نظر نہ تھے، جیسا کہ ایک رہنما کو ہونا چاہیے۔ شاعری اور خطابت اور انشا پردازی در اصل لفّاظی کا دوسرا نام ہے۔ چنانچہ یہ تمام رہنما لفظی بلند پروازی کے کرشمے دکھاتے رہے، حقائقِ حیات کے اعتبار سے وہ مسلمانوں کو ٹھوس رہنمائی نہ دے سکے۔

اس تخیلاتی رہنمائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ رہنما حضرات کی اپنی شخصیت تو بن گئی مگر ملّت کا تمام معاملہ برباد ہو کر رہ گیا۔ ہوائی کرشمے دکھانے والا ایک شخص بذات خود اخبار کی سرخیوں میں جگہ پا سکتا ہے، مگر ہوائی کرشمے دکھانے سے کسی قوم کے مستقبل کی تعمیر نہیں ہوتی۔

ایک تجربہ

ایک ہندو خاتون شوبھا دے (Shobha De) کا مضمون ٹائمس آف انڈیا (۱۲ جولائی ۱۹۸۷) میں شائع ہوا ہے۔ وہ ایک مندر میں داخل ہونا چاہتی تھیں۔ دروازہ پر پہونچیں تو ایک پجاری نے ان کو سخت نظروں سے دیکھا اور کہا: "اندر نہیں جا سکتے"۔ خاتون نے ابتدائً معاملہ کو نہیں سمجھا اور پارڈن (Pardon) کہہ کر آگے بڑھنا چاہا۔ مگر انگریزی لفظ بولنا ان کے معاملہ کو اور نازک بنانے کا سبب بن گیا۔ اس نے ٹوٹی ہوئی انگریزی میں کہا:

No enter for you.

یہ پوری کا مشہور جگنّاتھ مندر تھا۔ خاتون حیرانی کے ساتھ دروازہ پر کھڑی رہیں۔ کچھ دیر کے بعد وہ پجاری دوبارہ ان کی طرف مخاطب ہوا اور کہا کہ "اب کیا ہے"۔ خاتون نے پوچھا کہ آخر کس وجہ سے مجھ کو مندر میں جانے سے روکا جا رہا ہے۔ اس نے کہا کہ یہ صرف ہندوؤں کے لیے ہے۔ بات بڑھی تو وہ ایک پنڈا کو بلا کر لے آیا۔ اس نے کہا کہ "بہن جی، آپ سمجھتے کیوں نہیں"۔ خاتون بگڑ گئیں۔ آخر پنڈا نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ "جاؤ، جاؤ"۔

بعد کو مندر کے ایک آدمی نے خاتون سے کہا کہ آپ ہندو دکھائی نہیں دیتیں۔ انھوں نے کہا کہ "کیوں نہیں"۔ آدمی نے کہا: اس لیے کہ آپ بندی پہنے ہوئے نہیں ہیں۔ اس طرح بات ہوتی رہی یہاں تک کہ مندر کے آدمی نے پوچھا: "آپ کا شبھ نام"۔ خاتون نے جھنجھلا کر نام بتایا تو ایک "ماہر" بلایا گیا۔ اس نے غور کرنے کے بعد کہا: یہ ہندو نام تو ہے، مگر یہ پچھی نام ہے۔ خاتون اس قسم کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

The whole sham game was reinforcing all my prejudices against the fraud of organised religion.

یہ تمام مصنوعی کھیل میرے اس مخالفانہ رجحان کو اور پختہ کر رہا تھا جو منظم مذہب کے فریب کے بارہ میں میرے اندر موجود تھا (ٹائمس آف انڈیا ۱۲ جولائی ۱۹۸۷)

ہندو خاتون آخر میں کہتی ہیں کہ اس تجربہ سے مجھے بہت دکھ پہونچا۔ مشہور ہندو رواداری

کے بجائے میرا سابقہ تنگ نظری اور تعصب کے ساتھ پیش آیا۔ وہ اپنے مضمون کو اس جملہ پر ختم کرتی ہیں :

I suddenly felt ashamed of having born a Hindu.

اچانک مجھے اپنے ہندو پیدا ہونے پر شرم محسوس ہونے لگی۔

مذہب اصلاً خدا اور بندے کے درمیان تعلق کا نام ہے۔ تمام پیغمبروں نے یہ کیا کہ انھوں نے اس تعلق کی صحیح نوعیت کو بتایا۔ خدا کیا ہے اور بندہ کیا ہے۔ خدا اور بندہ کے درمیان کس طرح تعلق قائم ہوسکتا ہے۔ اس تعلق کے حدود اور نتائج کیا ہیں، یہ سب باتیں پیغمبروں نے واضح طور پر بتائیں۔ ہر پیغمبر کا یہی مشن تھا، اور اس مشن کو ہر ایک نے کامل طور پر انجام دیا۔

مگر اب اسلام اور دوسرے مذہبوں میں ایک فرق واقع ہوگیا ہے۔ دوسرے تمام مذاہب نے بعد کو وہ صورت اختیار کرلی جس کو "منظم مذہب" کہا جاتا ہے۔ پیغمبر کے بعد آنے والے لوگوں نے خود سے ایک ڈھانچہ بنایا اور اس کو مقدس قرار دے کر لوگوں سے مطالبہ کیا کہ وہ اس کی پیروی کریں۔ مزید یہ کہ ان مذاہب کی اصل ابتدائی تعلیمات محفوظ نہیں رہیں، اس لیے اب کوئی ایسی کسوٹی باقی نہیں جس پر جانچ کر اس ڈھانچہ کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کیا جائے۔

اس معاملہ میں اسلام کا کیس بنیادی طور پر مختلف ہے۔ اسلام میں بھی اگرچہ ایسا ہوا کہ بعد کے لوگوں نے بہت سے اضافے کیے۔ مگر اہم بات یہ ہے کہ اسلام کی اصل کتاب اور اس کی ابتدائی تعلیمات اپنی سابقہ شکل میں پوری طرح محفوظ ہیں۔ اس لیے ہر شخص کے لیے ممکن ہے کہ وہ اس کی روشنی میں جانچ کر معلوم کرسکے کہ کون سی بات خدا اور پیغمبر کی بات ہے، اور کون سی بات وہ ہے جو بعد کے انسانوں نے خود سے اضافہ کرکے خدا کے دین میں شامل کردیا۔

اسی فرق کا یہ نتیجہ ہے کہ اسلام میں خدا اور بندے کے درمیان کوئی اور حائل نہیں۔ جب کہ دوسرے تمام مذاہب میں بگاڑ کے نتیجہ میں ایسا ہوا کہ خدا اور بندے کے درمیان ایک اور طبقہ حائل ہوگیا۔ وہ چیز جس کو موجودہ زمانہ میں "منظم مذہب" کہا جاتا ہے، وہ دراصل محرّف مذہب کا دوسرا نام ہے۔ اس اعتبار سے اب صرف اسلام ہی ایک ایسا دین ہے جو منظم مذہب نہیں۔ بقیہ تمام ادیان منظم مذہب کی صورت اختیار کرچکے ہیں۔

غلط فہمی

لندن یونیورسٹی کے ڈاکٹر پیٹر ہارڈی (Peter Hardy) کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے برطانوی ہند کے مسلمان *The Muslims of British India* اس کتاب کے ایک باب میں مصنف نے کہا ہے کہ ملک کی تقسیم نے مسلمانوں کے مسئلہ کو حل نہیں کیا۔ یہ بتاتے ہوئے کہ مسلمانوں کے نزدیک اسلام ایک مکمل نظام ہے، انھوں نے موجودہ ہندستان کے مسلمانوں سے ایک سوال کیا ہے جو ان کے الفاظ میں یہ ہے:

> Whether in wanting to be accepted as a fellow-citizen on equal terms with his non-Muslim compatriots he is obeying or disobeying Divine Commands.

مسلمانوں کا یہ چاہنا کہ وہ اپنے غیر مسلم ہم وطنوں کے ساتھ برابر کی شرائط پر یکساں درجہ کے شہری تسلیم کیے جائیں، یہ خدا کے حکم کی فرماں برداری ہے یا اس کی نافرمانی (ٹائمس آف انڈیا ۸ اپریل ۱۹۸۸)

جو لوگ اسلام کی تعبیر "مکمل نظام" کے الفاظ میں کرتے ہیں۔ اور یہ کہتے ہیں کہ یہ مکمل نظام ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے، ان کے لحاظ سے یہ سوال بے حد اہم ہے۔ ان حضرات کے بیانات کے مطابق وہ شخص اسلام کا ناقص پیرو قرار پاتا ہے جو اعتقادی اسلام کو اختیار کرے مگر سیاسی اسلام کو اختیار نہ کرے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے وہ شخص ناقص عبادت گزار ہے جو نماز پڑھے اور روزہ نہ رکھے۔ اب اگر واقعۃً اسلام یہی ہو تو "ہندو انڈیا یا سیکولر ہندستان" میں مسلمانوں کے لیے برابری کا دستوری اور قانونی حق مانگنا کسی طرح جائز نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ مذکورہ تعبیر کے مطابق یہ "باطل نظام" میں حصہ داری کا مطالبہ کرنا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ہندستان کے مسلمان یہ مانگ کرنے لگیں کہ ہم کو ملک کے بت خانوں کے اندرونی نظام میں برابر کا شریک بنایا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ نام نہاد مفکرین کی مذکورہ اسلامی تعبیر کا لازمی نتیجہ وہی نکلتا ہے جس کی طرف ڈاکٹر ہارڈی نے طنزیہ طور پر اشارہ کیا ہے۔ کیوں کہ اس تعبیر کے مطابق، مسلمان کسی دوسرے نظام میں صرف باغی کی حیثیت سے رہ سکتے ہیں۔ وہ ایسے کسی نظام میں وفادار یا شریک کار بن کر نہیں رہ سکتے۔ مگر اسلام کی یہ تعبیر سراسر خود ساختہ ہے جس سے اسلام بری ہے۔

یہ نام نہاد "کامل تعبیر" کچھ شاعروں اور انشا پردازوں کے ذہن کی پیداوار ہے، اس کا قرآن وحدیث سے کوئی تعلق نہیں۔

اس موضوع پر راقم الحروف نے اپنی کتاب "تعبیر کی غلطی" میں تفصیلی گفتگو کی ہے۔ اور علمی دلائل سے اسے رد کر دیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کامل سپردگی (Total Submission) کا نام ہے نہ کہ کامل نظام (Total system) کا۔ ایک شخص جو اللہ پر ایمان لائے اس کو اپنی سوچ، اپنے جذبات، اپنے کردار اور اپنی عبادت گزاری میں کامل طور پر خدا کا فرمانبردار ہونا چاہیے۔ بحیثیت ایک فرد کے اس کو پوری طرح خدا کا بندہ بن کر رہنا چاہیے۔ حتی کہ جو شخص سیاسی اقتدار کی کرسی پر ہو، وہ بھی اپنی انفرادی حیثیت ہی میں اللہ کے یہاں جواب دہ ہے نہ کہ اجتماعی حیثیت میں۔

جہاں تک اجتماعی نظام کا تعلق ہے، اس کا معاملہ اس سے بالکل الگ ہے۔ انفرادی احکام علی الاطلاق مطلوب ہیں۔ جب کہ اجتماعی احکام حالات کی نسبت سے مطلوب ہوتے ہیں۔ ایک شخص اگر اپنے انفرادی اختیار کے دائرہ میں اسلامی احکام کو اختیار کرلے تو وہ کامل مسلم ہوگیا۔ اس کے اسلام کی تکمیل اس پر منحصر نہیں کہ وہ انفرادی اختیار کے دائرہ سے باہر اجتماعی اختیار کے دائرہ میں بھی لازماً اسلام کی پیروی کرے۔

اس معاملہ کو زکواۃ کی مثال سے سمجھا جاسکتا ہے۔ زکواۃ مسلمان کے اوپر اسی طرح فرض ہے جس طرح نماز فرض ہے۔ مگر دونوں کے درمیان ایک بنیادی فرق ہے۔ نماز ایک ایسا حکم ہے جس کی ادائیگی ہر حال میں لازم ہے۔ نماز ایک مسلمان سے کسی حال میں ساقط نہیں ہوتی۔ مگر زکواۃ کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ ایک شخص اگر صاحب نصاب ہو تو اس کے لیے زکواۃ کی ادائیگی ضروری ہوگی۔ مگر جو شخص صاحب نصاب نہ ہو اس پر نہ زکواۃ کی ادائیگی واجب ہے، اور نہ یہ واجب ہے کہ وہ کمائی کرکے صاحب نصاب بنے تاکہ وہ قرآنی حکم کے مطابق زکواۃ ادا کرسکے۔

مذکورہ ذہن کے لوگ ہندستان کو غلبۂ کفر کا ملک سمجھتے ہیں۔ مگر یہ سراسر جہالت ہے۔ ہندستان ایک سیکولر ملک ہے۔ دستور کے مطابق یہاں ہر مذہب کو یکساں طور پر آزادی حاصل ہے۔ یہاں کی حکومت مذہبی امور میں عدم مداخلت کی پابند ہے۔ اس لیے صحیح بات یہ ہے کہ ہندستان سیاسی اعتبار سے، غلبہ ناطرفداری کا ملک ہے نہ کہ غلبہ کفر کا ملک۔

عبرت ناک

ٹائمس آف انڈیا (۲۱ اپریل ۱۹۸۸) میں ایک خبر اورنگ آباد کے میونسپل کارپوریشن کے الکشن (اپریل ۱۹۸۸) سے متعلق ہے جہاں شیوسینا نے ۶۰ سیٹوں میں سے ۲۷ سیٹوں پر قبضہ کرلیا ہے۔ شیوسینا تین سال پہلے ختم شدہ طاقت (Spent force) کی حیثیت اختیار کرچکی تھی۔ نیز یہ کہ اس سے پہلے وہ زیادہ تر بمبئی کی ایک جماعت سمجھی جاتی تھی۔ مگر اورنگ آباد کے الکشن میں کامیابی نے ظاہر کیا ہے کہ وہ نہ صرف از سر نو زندہ ہوگئی ہے بلکہ اس نے پورے مہاراشٹر میں اپنے اثرات پھیلا لیے ہیں۔ شیوسینا نے یہ کامیابی ہندو ایکتا کا نعرہ لگا کر حاصل کی ہے۔ اس کا ایک خاص نعرہ یہ تھا "گورو سے کہو ہم ہندو ہیں":

Be proud to say you are a Hindu.

اورنگ آباد میں ۲۵ فی صد سے زیادہ مسلمان ہیں۔ بعض حلقۂ انتخاب ایسے ہیں جہاں مسلم ووٹ اکثریت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر شیوسینا نے ایک خالص مسلم حلقہ میں بھی کامیابی حاصل کرلی۔ یہاں تین مسلم امیدوار تھے جس کی وجہ سے ان کے ووٹ بٹ گیے:

The Sena was also reported to have won a Muslim-dominated constituency because there were three Muslim candidates and (Muslim) votes were divided.

یہ واقعہ مسلمانوں کی دہرا نادانی کو بتا رہا ہے۔ یہ درحقیقت مسلمان ہیں جنھوں نے شیوسینا کے خلاف شور وغل کرکے اس کو زندہ کیا۔ مسلمان اگر اس کے معاملہ میں اعراض کا طریقہ اختیار کرتے تو اب تک وہ اپنے آپ ختم ہوجاتی۔ مزید یہ کہ جس جماعت کو وہ اپنے لیے سب سے بڑا خطرہ بتاتے ہیں، اس کے خلاف بھی وہ متحد نہیں ہوسکتے۔ حتی کہ اپنے عدم اتحاد کی وجہ سے بالواسطہ طور پر اس کی کامیابی کا سبب بن جاتے ہیں۔

جن لوگوں کا یہ حال ہو، ان کے بارے میں کم سے کم جو بات کہی جاسکتی ہے وہ یہ کہ ——— سچا عمل تو درکنار، جھوٹا عمل کرنے کی صلاحیت بھی ان کے اندر باقی نہیں۔ بولنا تو درکنار، نہ بولنے کا فن بھی انھیں نہیں آتا۔

ایک سفر

حلقہ الرسالہ کی دعوت پر ستنا اور ریوا کا سفر ہوا۔ یہ دونوں مدھیہ پردیش کے شہر ہیں۔ ستنا اس سے پہلے بگھیل کھنڈ کے لئے برطانیہ کے پولیٹکل ایجنٹ کا صدر مقام (۱۹۲۱-۱۸۷۱) تھا۔

ستنا ضلع میں، شہر سے قریب ایک تاریخی گاؤں بھرہت (Bharhut) ہے۔ یہاں بدھوں کے ایک استوپا کے کھنڈرات ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ابتداءً اشوک کے زمانہ میں ۲۵۰ ق م میں تعمیر کیا گیا۔ اس کے بعد دوسری صدی عیسوی میں اس کی مزید توسیع ہوئی۔ یہاں بہت سے کتبات ہیں۔ یہاں بڑی تعداد میں تاریخی مورتیاں اور سنگ تراشی کے نمونے پائے گئے ہیں جن میں سے کچھ الٰہ آباد کے میوزیم میں ہیں اور کچھ کلکتہ کے میوزیم میں محفوظ کر دئے گئے ہیں۔

یہ تاریخی استوپا صدیوں سے لامعلوم پڑا ہوا تھا، پہلی بار اس کو میجر جنرل الکزینڈر کننگھم (Alexander Cunningham) نے ۱۸۷۳ میں دریافت کیا۔ موجودہ زمانہ میں ایشیائی قوموں کے تاریخی آثار اور علمی نوادر کا پتہ لگانے اور انھیں محفوظ کرنے کا کام زیادہ تر مغربی لوگوں نے کیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں مغربی قوموں کے غلبہ کا راز ان کی یہی افادیت ہے نہ کہ محض ظلم۔ ظلم محض کی بنیاد پر کبھی کوئی قوم غلبہ اور ترقی کا مقام حاصل نہیں کر سکتی۔

ریوا تعلیم کے اعتبار سے، ستنا سے آگے ہے۔ سابق راجہ نے ۱۵۹۷ میں ریوا کو اپنی راجدھانی قرار دیا تھا۔ اس وقت سے ریوا کی اہمیت کافی بڑھ گئی۔ ۱۹۶۸ میں یہاں پرتاپ سنگھ یونیورسٹی قائم ہوئی۔ بندھوگڑھ میں ۴۰۰ - ۲۰۰ء کے زمانہ کے کتبات موجود ہیں۔ بگھیل راجپوتوں نے یہاں ۱۴۰۰ء میں اپنی اسٹیٹ قائم کی تھی جو آزادی کے بعد ختم ہوگئی۔

۲۷ مارچ ۱۹۸۸ کی شام کو ۱۵۰ آپ سے روانگی ہوئی۔ یہ ٹرین نظام الدین اور جبلپور کے درمیان چلتی ہے۔ پہلے اس کا نام قطب اکسپرس تھا۔ حال میں اس کا نام بدل دیا گیا ہے۔ گاڑی وہی ہے، مگر اب اس کا نام مہاکوشل اکسپرس ہے۔ دوسرے ملکوں کے لوگ جانتے ہیں کہ اگر حقیقت کو بدلنا ہے تو انھیں خود حقیقت کو بدلنا پڑے گا۔ مگر ہندستان اور پاکستان کو یہ

انوکھی خوش قسمتی حاصل ہے کہ یہاں حقیقت کو بدلنے کے لئے یہ کافی ہے کہ الفاظ بدل دئے جائیں۔ ہندستان میں ایک لفظ کے بدلنے سے "قطب اکسپرس" "مہاکوشل اکسپرس" ہوجاتی ہے۔ اور پاکستان میں معمولی لفظی تبدیلی سے "کرشن نگر" اچانک "اسلام نگر" بن جاتا ہے۔

تاہم زمانہ شاید اپنی سست رفتاری کی بنا پر ان ملکوں کی بلند پروازی کا ساتھ نہ دے سکا۔ ہندستان اور پاکستان الفاظ کے اعتبار سے اپنے ترقیاتی سفر کے آخری زینہ پر پہنچ چکے ہیں، مگر واقعہ کے اعتبار سے دیکھئے تو ابھی وہ پہلے زینہ پر بھی اپنا قدم جمانے میں کامیاب نہ ہوسکے۔

مانک پور سے ٹرین آگے بڑھی تو ۲۸ مارچ کا سورج نکل رہا تھا۔ صبح اور شام کی تقسیم زمین کی گردش سے پیدا ہوتی ہے۔ مگر بظاہر وہ سورج کی گردش سے پیدا ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ چنانچہ بطلیموس (Ptolemy) سے لے کر کوپرنیکس (Copernicus) تک تقریباً دو ہزار سال ایسے گزرے ہیں کہ انسان اسی غلط فہمی میں مبتلا رہا کہ صبح و شام کا فرق سورج کی گردش کا کرشمہ ہے۔ اس مثال کے ذریعہ شاید انسان کو یہ سبق دیا جارہا ہے کہ چیزوں کو ظاہری صورت (Face value) پر نہ لو بلکہ گہرائی تک جاکر اصل حقیقت معلوم کرو۔ کیوں کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ حقیقت کچھ اور ہوتی ہے اور ظاہر میں کچھ اور دکھائی دیتی ہے۔

یہاں ریلوے لائن کے دونوں طرف دور تک کھلے ہوئے جنگل تھے۔ ان جنگلات میں کثرت سے ڈھاک کے درخت نظر آئے۔ ڈھاک ایک معمولی درخت ہے۔ مگر اس کے پھول نہایت حسین ہوتے ہیں۔ لکڑی کے ٹھنٹھ جیسے تنہ پر لال رنگ کے حد درجہ خوشنما پھول لدے ہوئے تھے۔ یہ منظر گویا تقسیم خداوندی کی بے نیازی کو بتا رہا تھا۔ خدا چاہے تو لکڑی کے ایک ٹھنٹھ کو حسین پھولوں سے ڈھک دے، اور ایک بظاہر شاداب درخت کو بے پھول کرکے چھوڑ دے۔ خدا کے یہاں انعامات کی تقسیم کا معیار اس سے مختلف ہے جو انسانوں نے اپنے درمیان رائج کر رکھا ہے۔

میں نے جس روٹ پر سفر کیا، اس کی صورت کچھ اس طرح ہے کہ مانک پور تک ٹرین ایک رخ پر چلتی ہے، اس کے بعد انجن آگے سے نکال کر پیچھے کی طرف جوڑ دیا جاتا ہے، اور ٹرین انگریزی کے حرف وی (V) کی شکل میں الٹے رخ پر دوڑنے لگتی ہے۔

مانک پور کے بعد جب ہماری گاڑی "پیچھے کی طرف" چلنے لگی تو اس کو دیکھ کر مجھے خیال

آیا کہ زندگی کے سفر کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ ہر آدمی آگے کی طرف جانا چاہتا ہے۔ مگر اس دنیا کا نظام کچھ اس ڈھنگ پر بنا ہے کہ یہاں کبھی آگے بڑھنے کے لئے پیچھے ہٹنا پڑتا ہے، جیت کو حاصل کرنے کے لئے ہار کو قبول کرنا پڑتا ہے۔ کوئی ممتاز کام کرنے کے لئے گم نامی کی حیثیت پر راضی ہونا پڑتا ہے۔ یہی اس دنیا کا قانون ہے۔ اس دنیا میں جو لوگ "پسپائی" پر راضی نہ ہوں وہ کبھی "اقدام" کی سعادت حاصل نہیں کر سکتے۔

پہلی بار میں غالباً ۱۹۶۱ میں ستنا آیا تھا۔ اس وقت میرے چھوٹے بھائی اے۔ ایم خان انجینئر یہاں ٹکنکل انسٹی ٹیوٹ میں پرنسپل تھے، میری والدہ ان کے ساتھ مقیم تھیں۔ والدہ سے ملاقات کے لئے میں نے رام پور سے ستنا کا سفر کیا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ روزانہ شام کو میں تنہا ٹہلنے کے لئے نکلتا تھا اور ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ دور تک چلا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ میرے چاروں طرف صرف قدرت کا ماحول میری ہمنوائی کے لئے باقی رہتا تھا۔ شہر کے باسیوں سے میں صرف الفاظ کی زبان میں بات کر سکتا تھا۔ مگر یہاں میرے قریب ایک ایسی دنیا ہوتی تھی جس سے الفاظ کے بغیر کلام ہوتا ہے۔ اور جب مخاطب اور متکلم غیر ملفوظ کلام میں مشغول ہوں تو لذت کلام بے حساب گنا حد تک بڑھ جاتی ہے، کیوں کہ ملفوظ کلام محدود ہوتا ہے اور غیر ملفوظ کلام غیر محدود۔

اس علاقہ کا اس سے پہلے میں ایک اور سفر کر چکا ہوں۔ یہ سفر اصلاً سیونی کے جلسۂ سیرت میں شرکت کے لئے تھا۔ اس سلسلہ میں میں ایک روز کے لئے جبل پور بھی ٹھہرا تھا۔ سیونی شہر ۱۷۴۷ء میں آباد ہوا۔ جبل پور مدھیہ پردیش کا دوسرا سب سے بڑا شہر ہے۔ ۱۷۸۱ء میں مرہٹوں نے جبل پور کو اپنا صدر مقام بنایا تھا۔ یہاں پانچویں صدی کے بدھسٹ، ہندو اور جین مذہب کے تاریخی آثار ہیں۔

اس سفر کا کوئی سفر نامہ لکھا نہیں جا سکا تھا۔ اب مجھے تاریخ کی تلاش ہوئی۔ مگر اس کی تاریخ مجھے یاد نہیں تھی۔ پرانے کاغذات کو دیکھا تو اس میں اتفاق سے وہ پوسٹر مل گیا جس میں سیونی کے جلسۂ سیرت کے منتظمین نے میرے نام کے ساتھ جلسہ کا اعلان شائع کیا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ سیرت کا یہ جلسہ ۱۴۔ ۱۶ فروری ۱۹۸۱ کو ہوا تھا۔ اس تجربہ کے بعد اس پرانے مقولہ کی حکمت سمجھ میں آئی

کہ ـــــــ داشتہ آید بکار ۔

تحریر بھی اللہ تعالیٰ کی بڑی عجیب نعمت ہے۔ تحریر کے ذریعہ یہ ممکن ہوا ہے کہ واقعات کو اس طرح منضبط کیا جاسکے کہ لمبی مدت گزرنے کے بعد بھی وہ عین اپنی سابقہ صورت میں محفوظ رہیں۔ قرآن میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تعلیم بالقلم کو انسانوں کی ہدایت کا ذریعہ بنایا۔ موجودہ زمانہ میں قلم یا تحریر کے اس فن میں بے شمار ترقیاں ہو چکی ہیں، مگر عجیب بات ہے کہ قلم کے اعلیٰ استعمال میں سب سے پیچھے وہ لوگ ہیں جنھوں نے سب سے پہلے دنیا کو قلم کی قوت کا راز بتایا تھا۔

سفر عام طور پر دو قسم کے ہوتے ہیں، تفریح یا تجارت۔ مگر تیسری زیادہ اہم قسم اس میں چھوٹ گئی ہے۔ اور وہ ہے عبرت۔ اسلامی سفر وہ ہے جو عبرت کا سفر ہو۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی اسی اعلان کے ساتھ اپنے گھر سے نکلے کہ وہ عبرت حاصل کرنے کے لئے باہر جا رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی عبرت پذیری کے ذہن کے تحت سفر کرے تاکہ ہر سفر اس کے لئے سبق کا ذریعہ بن جائے۔

اصل یہ ہے کہ سفر انسانی شخصیت کی توسیع ہے۔ ایک شخص جو اپنے گھر پر نظر عبرت کے ساتھ رہ رہا ہو، جب وہ باہر نکلے گا تو اس کا سابقہ ذہن وہاں بھی کام کرتا رہے گا۔ اسی طرح جو شخص مفاد پرست ہو، اس کا سفر بھی اس کے لئے مفادات کی تلاش کے ہم معنی ہو جائے گا۔ ایک بیرونی سفر میں میں نے ایک صاحب کو دیکھا کہ وہ اخبار والوں کو تلاش کرتے پھر رہے تھے تاکہ وہاں پہنچنے کے ساتھ اپنی آمد کی خبر اور اپنا انٹرویو چھپوا کر مقامی طور پر متعارف ہو سکیں۔ یہی موجودہ زمانہ میں بیشتر لوگوں کا حال ہے، کچھ لوگ نام ونمود کے اس ذاتی شوق کی تسکین برہنہ انداز میں کرتے ہیں اور کچھ لوگ پردہ داری کے ساتھ اسے انجام دیتے ہیں۔

عام طور پر سفر میں میں اس طرح نکلتا ہوں کہ میرے ساتھ ایک چھوٹے سے بیگ کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا، حتی کہ ایک گلاس بھی نہیں۔ ایک بار میں کسی سفر پر نکلا تو اتفاق سے میرے ساتھ ایک چھوٹا لوٹا بھی تھا۔ مزید اتفاق یہ کہ یہ لوٹا بغیر ٹوٹی والا تھا۔ ایک مسلمان بزرگ نے اس کو دیکھ کر کہا: اس قسم کا لوٹا ہندو تہذیب کی علامت ہے، آپ مسلمان ہیں، آپ کو ٹوٹی دار لوٹا اپنے ساتھ رکھنا چاہئے۔

مسلمان پچھلے سو برس سے اسی قسم کے جھگڑوں میں مشغول ہیں۔ اور اس کو تہذیبی شناخت (Cultural identity) کا خوبصورت نام دیئے ہوئے ہیں۔ مسلم قائدین اس معاملہ میں اس انتہا پر پہنچ گئے ہیں کہ وہ تہذیبی شناخت کے نام پر حکومت کے خلاف مطالباتی مہم چلا رہے ہیں۔ حالاں کہ تہذیبی شناخت کسی گروہ کی اندرونی حالت کا اظہار ہے، وہ خارجی مطالبہ سے حاصل کی جانے والی چیز نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمان کی پہچان اس قسم کی تہذیبی پہچان نہیں۔ مسلمان کی اصل پہچان اخلاقی پہچان ہے۔ مسلمان اپنے کردار سے پہچانا جاتا ہے نہ کہ خارجی علامتوں سے۔ قدیم مکہ میں پیغمبر اسلام اور آپ کے اصحاب داڑھی رکھتے تھے اور پگڑی اور تہمد پہنتے تھے۔ عین یہی طریقہ وہاں غیر مسلموں کا بھی تھا۔ رسول اللہ نے ایسا نہیں کیا کہ غیر مسلموں سے الگ اپنی "تہذیب" مقرر کریں۔ آپ نے مسلمانوں کے لئے جس امتیازی شناخت کی تلقین کی وہ یہ تھی کہ وہ ایک خدا کے پرستار بنیں۔ خوشی اور ناراضگی دونوں حالتوں میں حق پر قائم رہیں۔ جو کچھ اپنے لئے پسند کرتے ہیں وہی دوسروں کے لئے بھی پسند کریں۔ دوسروں کے لئے ان کے دل میں سلامتی اور خیر خواہی کا جذبہ ہو نہ کہ بغض اور حسد اور انتقام کا۔ مسلمان اگر یہ "پہچان" کھو دیں تو دوسری کسی پہچان کا چیمپئن بننا انھیں خدا کی نظر میں محبوب نہیں بنا سکتا۔

شام کو ۴ بجے ٹرین مجھ کو لے کر دہلی سے روانہ ہوئی۔ رات بھر چلنے کے بعد اگلے دن ۶ بجے ستنا کا اسٹیشن سامنے تھا۔ اب سفر کی مدت پوری ہو چکی تھی۔ دروازہ کھلا اور میں ٹرین سے باہر نکل کر "دوسری دنیا" میں آگیا۔

تکمیل سفر کا یہ تجربہ میرے ذہن میں تکمیل عمر کا تجربہ بن گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرا سفر حیات آخری مرحلہ میں پہنچ گیا ہو اور میں دنیا سے نکل کر آخرت کے عالم میں داخل ہو رہا ہوں۔ یہ لمحہ ہر آدمی پر آنے والا ہے۔ دنیا کا سفر شاید اسی لئے کرایا جاتا ہے کہ آدمی آخرت کے اصل سفر کو یاد کرے، وہ عارضی واقعہ میں مستقل واقعہ کی تصویر دیکھ لے، اور آخرت سے دوچار ہونے سے پہلے آخرت کی تیاری کر لے۔

ستنا میں میرا قیام جناب اقبال احمد صاحب ایم اے کے یہاں تھا۔

ستنا سے مجھے ریوا جانا تھا۔ یہ سفر روڈ کے ذریعہ طے ہوا۔ ہمارے ایک نوجوان ساتھی گاڑی چلا رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ سڑک پر جب سامنے سے کوئی گاڑی آتی ہے تو وہ اپنی گاڑی سائڈ میں کر لیتے ہیں۔ ایک طرف سے سامنے والی گاڑی گزر جاتی ہے اور دوسری طرف سے ہماری گاڑی۔ یہ واقعہ ملک کی سڑکوں پر ہر روز کروروں بار پیش آتا ہے اور بے شمار لوگ اس کو دیکھتے ہیں۔ مگر ہر آدمی اس کو "ٹریفک" کا ایک واقعہ سمجھتا ہے۔ کوئی شخص اس کو وسیع تر زندگی سے نہیں جوڑتا۔ حالاں کہ اس دنیا میں جو ٹریفک کا اصول ہے وہی زندگی کا اصول بھی ہے۔ اس دنیا میں دوسرے کو راستہ دینا پڑتا ہے اس کے بعد ہی اپنے لئے راستہ ملتا ہے۔ جو لوگ دوسروں کو راستہ دینے پر راضی نہ ہوں، ان کے لئے اپنا راستہ پانا بھی مقدر نہیں۔

ریوا میں میرا قیام جناب نعیم الدین صاحب نیہار کے یہاں تھا۔ گاڑی قیام گاہ پر رکی۔ میں باہر نکلا تو عین اسی وقت سڑک پر دو ہندو نوجوان سائیکل سوار وہاں آگئے۔ انھوں نے فوراً اپنی سائیکل روک دی، اور نرمی سے کہا "سر، تھوڑا سا ئڈ" یہ ریوا کے انسان سے میرا پہلا تعارف تھا۔ یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تعلقات نہایت اچھے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کا احترام کرتے ہیں۔ یہاں وہ فرقہ وارانہ مسائل نہیں جو یوپی جیسے علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔

اس فرق پر غور کرتے ہوئے میری سمجھ میں آیا کہ اس کی اصل جڑ مسلم بادشاہوں کی تاریخ ہے۔ جو علاقے مسلم بادشاہت کے مرکز تھے، جہاں ان کی یادگاریں ہیں، جہاں ان کے دور کی روایتیں موجود ہیں، وہاں کے مسلمانوں کے ذہن ابھی تک اسی "شاندار ماضی" میں اٹکے ہوئے ہیں۔ ان علاقوں کے حالات مسلمانوں کے اندر "پدرم سلطان بود" کی نفسیات کو زندہ رکھتے ہیں۔ اور یہی اس علاقہ کے مسلمانوں کا اصل مسئلہ ہے۔ چنانچہ جن علاقوں میں اس نفسیات کے اسباب نہیں ہیں، وہاں کے مسلمانوں کے لئے کوئی مسئلہ بھی نہیں۔

ریوا کے جنگلات کسی زمانہ میں شیر کے لئے مشہور تھے۔ دہلی کے چڑیا گھر کا سفید شیر اسی ریوا کے جنگل سے حاصل کیا گیا تھا۔ ۱۹۵۱ میں ریوا کے جنگل میں ایک سفید شیر پکڑا گیا۔ یہ ۹ ماہ کا بچہ تھا۔ اس کا نام "موہن" رکھا گیا۔ اور راجہ کے محل میں اس کی پرورش ہوئی۔ بڑا ہونے کے بعد ۱۹۵۵ میں ایک عام رنگ کی شیرنی سے اس کا جوڑا ملایا گیا۔ اس کے نتیجے میں چار بچے پیدا ہوئے مگر وہ

سب عام شیروں جیسے تھے۔ اس کے بعد دوبارہ ان میں سے ایک شیرنی کا اور موہن کا جوڑا ملایا گیا۔ اس تعلق کے بعد ۱۹۵۸ میں چار بچے پیدا ہوئے اور یہ چاروں سفید تھے ——— یہ گویا قدرت کا سبق ہے کہ پہلی کوشش میں اگر تمہیں کامیابی نہ ہو تب بھی تم کو ناامید نہ ہونا چاہئے۔

سفید شیر بہت نادر قسم ہے۔ ساری دنیا میں اس وقت تقریباً ۷۰ سفید شیر پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ۲۵ شیر صرف ہندستان میں ہیں۔ سفید شیر عادات و خصائل کے اعتبار سے دوسرے شیروں جیسا ہی ہوتا ہے۔

شیر دودھ والے جانوروں کا شکار کرکے کھاتا ہے۔ وہ بھیڑیا اور سانپ جیسے جانوروں کو نہیں کھاتا۔ تاہم اس معاملے میں بھی وہ ایک فرق کو ہمیشہ ملحوظ رکھتا ہے۔ اگر آپ شیر کے بارہ میں کوئی کتاب پڑھیں تو شیر کا عالم آپ کو بتائے گا کہ شیر انھیں جانوروں پر حملہ کرتا ہے جن کے متعلق وہ جانتا ہے کہ وہ آسانی کے ساتھ ان پر قابو پا سکتا ہے۔ بڑے جانور، جیسے ہاتھی، جنگلی بھینسا وغیرہ پر حملہ کرنے سے وہ عام طور پر احتراز کرتا ہے:

Healthy large mammals are generally avoided (IX/1004).

یہ شیر کا طریقہ ہے جو خدا کی فطرت گاہ میں تربیت پاکر نکلتا ہے۔ انسان کو خدا نے آزاد کرکے اسے عقل دیدی کہ وہ خود اپنے فیصلہ سے صحیح طرز عمل اختیار کرے۔ مگر انسان کمزور ہونے کے باوجود، اپنے سے طاقت ور پر حملہ کرتا ہے۔ اور پھر جب لازمی نتیجہ کے طور پر برباد ہوتا ہے تو دوسرا جرم یہ کرتا ہے کہ اپنی حماقت کا اعلان کرنے کے بجائے دوسروں کے ظلم اور سازش کا انکشاف کرنے میں مشغول ہو جاتا ہے۔

ریوا میں جن لوگوں سے ملاقات ہوئی ان میں سے ایک پرفیسر اختر حسین نظامی ہیں۔ انھوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے تاریخ میں ایم اے کیا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ ۱۹۲۷ سے ۱۹۳۵ تک علی گڑھ میں رہے ہیں۔ یہ سرسید کے پوتے راس مسعود کا زمانہ تھا۔ انھوں نے بتایا کہ راس مسعود جس زمانہ میں پیدا ہوئے اس وقت علی گڑھ میں ایک انگریز کلکٹر مسٹر راس (Ross) تھا۔ مسٹر راس کا نام مسعود میں جوڑ کر راس مسعود بنایا گیا۔ راس انگریز سے راس مسعود کے والد (سید محمود) کی دوستی تھی۔ اس انگریز افسر نے سید محمود سے کہا کہ تم اپنے لڑکے کے نام کے ساتھ میرا نام

"راس" جوڑ دو تو یہ ہماری دوستی کا مستقل نشان ہوگا چنانچہ مسعود کو راس مسعود کہا جانے لگا

دور جدید کی تاریخ میں صرف ایک ہی قابل ذکر مسلمان ہیں جنھوں نے جدید مغرب کی اہمیت کو محسوس کیا اور مسلمانوں کو اس طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ اور وہ سرسید ہیں۔ مگر سرسید گروپ کی پہنچ صرف مغرب کی تہذیبی تقلید تک ہوسکی، وہ مغرب کی سائنسی تقلید کی اہمیت کو نہ سمجھ سکے۔ تاہم پہلے شخص کی حیثیت سے سرسید کا گروہ قابل معافی ہوسکتا ہے۔ اگر ان کے بعد کوئی دوسرا شخص مسلمانوں میں اٹھتا جو مغربی سائنس کی اہمیت کی طرف مسلمانوں کو متوجہ کرتا تو ابتدائی کمی کی تلافی ہوجاتی مگر بدقسمتی سے ایسا نہ ہوسکا۔ اور مسلمان دور جدید میں دوسری قوموں سے کم از کم سو سال پیچھے ہوگئے۔

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے قانون میں اعلیٰ ڈگری لی ہے۔ اس کے بعد وہ پریکٹس کرنے والے تھے۔ اس درمیان میں انھیں الرسالہ اور دوسری کتابیں مل گئیں۔ انھوں نے ان کا مطالعہ کیا تو وہ بالکل بدل گئے۔ انھوں نے طے کیا کہ اب وہ پریکٹس کرنے کے بجائے "اسلامی قانون اور انسانی قانون" پر ریسرچ کریں گے۔ اور قانون میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے کر اس میدان میں دین کی خدمت کریں گے۔ چنانچہ وہ اس میدان میں سرگرم ہیں۔

ایک تعلیم یافتہ بزرگ میرے قیام کے دوران بار بار آتے رہے اور ہر مجلس میں شریک رہے انھوں نے کہا کہ میرا مسلک یہ ہے کہ میں ہر عالم کی عزت کرتا ہوں اور اسی جذبہ کے تحت آپ کی مجلسوں میں بھی شرکت کرتا رہا ہوں۔ میرا قول ہے کہ لا نفرق بین احد من العلماء (ہم ایک عالم اور دوسرے عالم کے درمیان فرق نہیں کرتے)

۲۸ مارچ کو نماز ظہر کے بعد بچھیا کی مسجد میں اجتماع تھا۔ اس موقع پر میں نے "اللہ اکبر" کی تشریح کی۔ میں نے کہا کہ یہ لفظ جو روزانہ نمازوں میں بار بار دہرایا جاتا ہے، اس کو آجکل کے مسلمانوں نے ایک قسم کا نعرہ بنا لیا ہے جس کو وہ اپنے قومی جھگڑوں اور لڑائیوں میں دوسروں کے خلاف استعمال کرتے ہیں۔ حالاں کہ "اللہ اکبر" نعرۂ احتساب ہے نہ کہ نعرۂ جنگ۔ اللہ اکبر کا پیغام یہ ہے کہ خدا بڑا ہے، اس لئے مجھے چھوٹا بن کر دنیا میں رہنا ہے۔ مگر مسلمانوں نے اس کا مطلب یہ سمجھ رکھا ہے کہ خدا بڑا ہے، اس لئے مجھے دوسروں کو چھوٹا بنانا ہے۔ جو لفظ حقیقۃً احتساب خویش کا عنوان تھا اس کو مسلمانوں نے احتساب غیر کا عنوان بنا دیا۔ اس قسم کی تبدیلی صرف فساد پیدا کرتی ہے، وہ کسی بھی درجہ میں کوئی

اصلاح پیدا نہیں کرتی۔ اس بات کو میں نے مختلف مثالوں کے ذریعہ واضح کیا۔

۲۸ مارچ کی شام کو وینکٹ بھون میں پروگرام تھا۔ اس میں مسلم اور غیر مسلم تعلیم یافتہ لوگ شریک تھے یہ ہال راجہ وینکٹ رمن سنگھ کا بنوایا ہوا ہے جو موجودہ راجہ مارتنڈ سنگھ (ایم پی) کے والد تھے۔ اس ہال کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں چار شیر بھس بھرے ہوئے (Stuffed) رکھے ہوئے ہیں۔

یہاں میری تقریر کا موضوع "اسلام اور انسانی برابری" تھا۔ اس میں قرآن وحدیث کی تعلیمات بتائی گئیں اور ان کو مختلف مثالوں سے واضح کیا گیا۔ ایک بنیادی بات میں نے یہ کہی کہ انسانوں کے درمیان ہمیشہ فرق ہوتا ہے، کوئی بڑا ہوتا ہے اور کوئی چھوٹا، کوئی طاقتور ہوتا ہے اور کوئی کمزور۔ اسی سے نابرابری کا ماحول پیدا ہوتا ہے۔ اس نوعیت کی نابرابری سماج میں ہمیشہ باقی رہے گی۔ انسانوں کی کاٹ چھانٹ کرکے آپ انھیں برابر نہیں کرسکتے، جیسا کہ کمیونزم نے ناکام طور پر کرنے کی کوشش کی۔

انسانوں کے درمیان برابری قائم کرنے کی عملی صورت صرف یہ ہے کہ ان کے درمیان ایسی ہستی کو کھڑا کر دیا جائے جس کے آگے سب اپنے کو چھوٹا محسوس کرنے لگیں۔ خدائے برتر کا عقیدہ یہی کام کرتا ہے۔ کسی سماج میں اگر خدا کی بڑائی زندہ عقیدہ کے طور پر آجائے تو وہاں اپنے آپ برابری اور مساوات کا ماحول قائم ہوجائے گا۔ کیوں کہ انسان آپس میں ایک دوسرے سے بڑے ہیں، مگر خدا کے مقابلہ میں کوئی بڑا نہیں۔

میں نے کہا کہ اس ہال میں چار مردہ شیر موجود ہیں۔ مگر موجودہ حالت میں وہ ہمارے اندر ہلچل پیدا نہیں کرتے۔ لیکن اگر ایسا ہو کہ چار زندہ شیر یہاں داخل ہوکر دھاڑنے لگیں تو معاملہ بالکل دوسرا ہوگا۔ آپس میں لوگ نابرابر ہیں، مگر زندہ شیر کے مقابلہ میں تمام لوگ برابر۔ ایک لطیفہ ہے کہ کچھ اونٹ آپس میں بحث کر رہے تھے کہ کون زیادہ اونچا ہے۔ چوں کہ ہر ایک میں تھوڑا تھوڑا فرق تھا۔ اس لئے فیصلہ نہیں ہو رہا تھا۔ کسی نے ان اونٹوں کو لے جاکر پہاڑ کے سامنے کھڑا کر دیا۔ اب سب اونٹ چپ ہوگئے، کیوں کہ جہاں پہاڑ آجائے وہاں کوئی اونٹ بڑا نہیں رہ جاتا۔

جب شیر اور پہاڑ لوگوں کے اونچ نیچ کو ختم کر دیتے ہیں تو وہ خدا جو تمام شیروں کا اور تمام پہاڑوں کا خالق ہے، اس کی موجودگی کا احساس لوگوں کو کتنا زیادہ متاثر کرے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ

نابرابری کو ختم کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ انسانوں کو ان کے خدا کے سامنے کھڑا کر دیا جائے۔

ریواسے ستنا کے لئے واپسی بذریعہ روڈ ہوئی۔ ہماری گاڑی کے ڈرائیور گلاب خاں (پیدائش ۱۹۲۶) تھے۔ وہ ستنا کے رہنے والے ہیں۔ اور پچھلے ۴۵ سال سے ڈرائیوری کا کام کرتے رہے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ اپنے تجربہ کی روشنی میں بتائیے کہ گاڑی میں ایکسیڈنٹ سے بچنے کی ترکیب کیا ہے۔ انھوں نے کہا:

"آگے کی پوزیشن کو دیکھ کر اپنے کو کنٹرول کرنا چاہئے۔"

اس میں شک نہیں کہ سڑک کی سواری کے لئے محفوظ سفر کا واحد راز یہی ہے۔ مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ زندگی کے وسیع تر سفر کو محفوظ اور کامیاب سفر بنانے کا راز بھی یہی ہے۔ کوئی شخص دنیا میں اکیلا نہیں ہے۔ جس طرح وہ خود زندگی کی دوڑ میں ہے، اسی طرح دوسرے لوگ بھی زندگی کی دوڑ لگا رہے ہیں۔ ایسی حالت میں دوسروں کی دوڑ سے سابقہ پیش آنا لازمی ہے۔ اس دوطرفہ دوڑ میں وہی شخص حادثہ سے بچ سکتا ہے جو سامنے والے کو دیکھ کر اپنے آپ کو قابو میں رکھے۔

ستنا کا ایک بڑا محلہ نذیر آباد کہا جاتا ہے۔ اس محلہ کے ساتھ ایک تاریخ وابستہ ہے جس میں بہت بڑا اسبق ہے۔

محلہ کا یہ نام حاجی نذیر احمد مرحوم (۱۹۶۰ - ۱۸۷۵) کے نام پر ہے۔ وہ یہاں کے بڑے زمیندار تھے۔ انھوں نے اسٹیشن کے قریب تقریباً پندرہ ایکڑ زمین لوگوں کو مکان بنانے کے لئے مفت دے دی۔ چنانچہ بہت سے لوگوں نے یہاں مکانات بنائے، جن میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی۔ تاہم اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ ان بسنے والوں نے معطی کے اعتراف کے طور پر محلہ کا نام نذیر آباد رکھ دیا۔

ستنا کی توسیع و ترقی کے ساتھ یہ جگہ اہم ہوتی گئی۔ چنانچہ کچھ فرقہ پرست ہندوؤں نے یہ تحریک چلائی کہ اس بستی کا نام نذیر آباد کے بجائے مالویہ نگر رکھ دیا جائے۔ انھوں نے اپنے گھروں اور دکانوں پر مالویہ نگر کے بورڈ لگائے۔ خطوط کے پتہ میں مالویہ نگر لکھنا شروع کیا۔ حتی کہ مالویہ نگر کے نام سے یہاں ایک چھوٹا سا ڈاک خانہ کھلوا دیا۔ مگر ان کی ساری کوششوں کے باوجود یہ نام مشہور نہ ہو سکا۔

ایک صاحب نے بتایا کہ ایک بار وہ ستنا کے دھرم شالہ میں گئے۔ وہاں ایک شخص باہر سے آیا تھا۔ اس کے پاس "مالویہ نگر" کا پتہ تھا۔ مگر دھرم شالہ میں کوئی شخص اس کو یہ بتانے والا نہیں ملا کہ "مالویہ

نگر" کہاں ہے۔ یہی حال اکثر ان خطوط کا ہوتا تھا جس پر مالویہ نگر لکھا ہوا ہوتا تھا۔ غرض فرقہ پرست افراد کی ساری کوششوں کے باوجود مالویہ نگر کا نام رائج نہ ہو سکا۔ اور نذیر آباد بدستور نذیر آباد ہی بنا رہا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ "مالویہ نگر" کے حامیوں کے پاس صرف تعصب تھا۔ اس کے مقابلہ میں "نذیر آباد" کے حامیوں کے پاس حقیقت تھی۔ اور جب تعصب اور حقیقت میں ٹکراؤ ہو تو حقیقت باقی رہتی ہے نہ کہ تعصب۔

ستنا کا نام ریونیو ریکارڈ میں رگھوراج نگر لکھا ہوا ہے۔ رگھوراج سنگھ یہاں کے راجہ تھے ان کے نام پر راجگان نے اس کا نام رگھوراج نگر رکھا تھا۔ مگر ستنا ریلوے اسٹیشن کا نام چونکہ ستنا تھا اس لئے عوام میں "ستنا" کا لفظ ہی جاری رہا، اور رگھوراج نگر جاری نہ ہو سکا۔

دوسری برعکس مثال مذکورہ بالا محلہ نذیر آباد کی ہے۔ بسانے والے مسلمان کے نام پر اس کا نام نذیر آباد ہے۔ یہاں کے فرقہ پرست عناصر نے اس کا نام "مالویہ نگر" رکھا اور ہر قسم کی کوشش کی کہ اس کا نام مالویہ نگر مشہور ہو جائے۔ مگر ساری کوشش کے باوجود نذیر آباد نذیر آباد ہی رہا، وہ مالویہ نگر نہ ہو سکا۔

زندگی میں جو چیز فیصلہ کن بنتی ہے وہ تعصب نہیں، حقیقت ہے۔ حقیقت باقی رہتی ہے، اور تعصب گرد و غبار بن کر فضا میں اڑ جاتا ہے۔ حقائق اگر "رگھوراج نگر" کے حق میں نہ ہوں بلکہ "ستنا" کے حق میں ہوں تو ستنا چل جائے گا، رگھوراج نگر نہیں چلے گا۔ اسی طرح حقائق اگر "نذیر آباد" کے حق میں ہوں، "مالویہ نگر" کے حق میں نہ ہوں، تو نذیر آباد چل جائے گا اور مالویہ نگر فضا میں گم ہو کر رہ جائے گا۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ حقائق کو اپنے موافق بنائے، کیوں کہ بالآخر جو چیز باقی رہتی ہے وہ حقائق ہیں نہ کہ تعصب اور ظلم۔

ایک صاحب نے بتایا کہ وہ ستنا سے جبل پور کے لئے بذریعہ کار روانہ ہوئے، ان کے پاس چار "الرسالہ کیسٹ" تھے۔ راستہ میں وہ ایک کے بعد ایک کیسٹ لگاتے گئے۔ اور راستہ چلتے ہوئے تمام کیسٹ سن لیا۔ ان کے ساتھ ایک وکیل صاحب بھی سفر کر رہے تھے۔ انھوں نے پہلی بار یہ کیسٹ سنا۔ انھوں نے کہا کہ یہ کیسٹ تو اتنے اثر انگیز تھے کہ پورا راستہ طے ہو گیا اور سفر کا اندازہ ہی نہیں

ہوا۔ وہ اس کی فکر سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے اور الرسالہ کے مستقل قاری بن گئے۔

آجکل کے مشغول انسان کے لئے آڈیو کیسٹ دعوت کا نہایت کارآمد ذریعہ ہے۔ میری مشغولیت کی وجہ سے الرسالہ کیسٹ کا سلسلہ ایک عرصہ سے بند تھا۔ اب خیال ہو رہا ہے کہ اس کو دوبارہ جاری کر دینا چاہئے۔

ملک کے دوسرے علاقوں کی طرح یہاں بھی خدا کے فضل سے الرسالہ کافی پھیلا ہے۔ جو شخص ایک بار الرسالہ پڑھ لیتا ہے، وہ خود ہی اس کا مبلغ بن جاتا ہے اور اس کو اپنے ماحول میں پھیلانا شروع کر دیتا ہے۔ ستنا کی ایک مسجد میں تذکیر القرآن مسلسل پڑھ کر سنائی جا رہی ہے۔ یہاں بہت سے غیر مسلم حضرات بھی الرسالہ اور کتابیں پڑھ رہے ہیں۔ مثلاً ٹھاکر لال بکرم جیت سنگھ کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ دلچسپی کے ساتھ "پیغمبر انقلاب" کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ پروفیسر کلیم احمد خاں صاحب نے اسلامی مرکز کی تمام چھوٹی بڑی کتابیں منگوا کر مجلد کرالی ہیں اور منظم طریقہ سے انھیں دوسروں کو پڑھا رہے ہیں۔ وغیرہ، وغیرہ۔

ستنا میں ایک صاحب نے میری گفتگو سننے کے بعد کہا کہ آپ صبر اور اعراض کی تلقین کرتے ہیں۔ حالاں کہ لقمان حکیم کا قول ہے کہ اتنے میٹھے نہ بنو کہ لوگ تم کو ہڑپ کر جائیں اور نہ اتنے کڑوے بنو کہ لوگ تمہیں تھوک دیں۔" اسی طرح ایک اور صاحب نے کہا کہ آپ ایڈجسٹمنٹ کی باتیں کرتے ہیں حالاں کہ اقبال نے کہا ہے:

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز

میں نے کہا کہ میں جو کچھ کہتا ہوں، قرآن و حدیث کے حوالہ سے کہتا ہوں، اور آپ لوگ اس کے جواب میں مقولہ اور شعر پیش کر رہے ہیں۔ جب کوئی بات قرآن و حدیث کے حوالے سے کہی جائے تو آدمی کو چاہئے کہ اس کے جواب میں قرآن و حدیث پیش کرے۔ اور اگر اس کے پاس قرآن و حدیث نہ ہو تو چپ رہے۔

حضرت عبد اللہ بن عباس نے بعد کے زمانہ میں ایک بار کسی مسئلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول لوگوں کو سنایا۔ انھوں نے اس کے جواب میں کہا کہ ابوبکر و عمر نے تو ایسا اور ایسا کہا ہے۔ اس پر حضرت عبد اللہ بن عباس غضب ناک ہو گئے۔ انھوں نے فرمایا: قریب ہے کہ تمہارے اوپر

آسمان سے پتھر برسیں۔ میں کہتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا، اور تم کہتے ہو کہ ابوبکر و عمر نے کہا (قال ابن عباس، یوشك ان تنزل علیکم حجارۃ من السماء۔ اقول قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وتقولون قال ابوبکر وعمر)

ایک صاحب نے کہا کہ آجکل اردو اخباروں اور رسالوں میں آپ کے خلاف لکھا جا رہا ہے، مگر آپ ان کا جواب نہیں دیتے۔ میں نے کہا کہ اگر کوئی شخص واقعی معنوں میں دینی یا علمی تنقید پیش کرے تو ہم ضرور اس کے بارہ میں لکھیں گے۔ مگر آجکل جو تحریریں ہمارے خلاف چھپ رہی ہیں ان میں کوئی دینی یا علمی دلیل نہیں۔ قرآن کی اصطلاح میں یہ سب لغو تحریریں ہیں اور لغو بات کے سلسلہ میں ہمیں اعراض کرنے اور درگذر کرنے کا حکم دیا گیا ہے (المؤمنون ۳، الفرقان ۷۲)

سورہ القصص (۵۵) میں اہل ایمان کی ایک جماعت کا ذکر ہے۔ کچھ لوگوں نے ان کے دین کا مذاق اڑایا، اور ان کے ساتھ جہالت کی۔ انھوں نے اس کا براہ راست جواب نہیں دیا۔ بلکہ یہ کہہ کر ان سے الگ ہو گئے کہ ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال ہیں۔ تم کو سلام، ہم بے سمجھ لوگوں سے الجھنا نہیں چاہتے۔

میں نے ان مخالفانہ تحریروں کو پڑھا تاکہ ان میں اگر واقعی کوئی بات ہو تو اس کی وضاحت کی جائے۔ مگر میں نے پایا کہ یہ تمام تحریریں بالکل غیر سنجیدہ ہیں۔ ان میں استہزاء، بے بنیاد الزام اور لفظی سب وشتم کے سوا اور کچھ نہیں۔ پھر ایسی لغو باتوں کا کیا جواب دیا جائے۔ اس قسم کے لغو کلام سے تو صرف اعراض ہی کیا جا سکتا ہے۔

مدھیہ پردیش ایک ہندی ریاست ہے۔ یہاں ۹۵ فی صد لوگ ہندی ہی میں لکھتے پڑھتے ہیں۔ اس بنا پر یہاں کے لوگوں نے شدت سے مطالبہ کیا کہ الرسالہ کا ہندی اڈیشن جاری کیا جائے۔ اس سلسلہ میں مزید بات یہ سامنے آئی کہ الرسالہ کا ہندی ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ صرف یہ کیا جائے کہ اردو الرسالہ ہی کو ہندی رسم الخط میں شائع کیا جائے۔

یہ بات مجھے بہت درست معلوم ہوتی ہے۔ میں نے ہندوؤں اور مسلمانوں سے ملاقاتوں کے دوران محسوس کیا کہ یہ لوگ خواہ اردو کو پڑھ نہ سکیں مگر وہ کم از کم آسان اردو کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ مثلاً بار ایسوسی ایشن کے اجتماع (۲۹ مارچ) میں ۹۹ فی صد ہندو صاحبان تھے اور سارا ہال

پوری طرح بھرا ہوا تھا۔ مگر میری اردو تقریر کو ہر آدمی نے پوری طرح سمجھا۔ اسی طرح دوسرے اجتماعات میں بھی ہندو صاحبان اور ہندی داں لوگ تھے، مگر کسی ایک شخص نے بھی یہ شکایت نہیں کی کہ آپ کی زبان سمجھ میں نہیں آئی۔

ان حالات کی روشنی میں ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ موجودہ اردو الرسالہ ہی کو رسم الخط بدل کر ہندی میں شائع کیا جائے۔ انشاء اللہ اس پر جلد عمل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جو اسلام کی سیاسی تعبیر سے متاثر ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کو سیاسی اور اجتماعی اعتبار سے غالب کرنے کے لئے آپ کے پاس کیا پروگرام ہے۔ کیوں کہ آج سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ مسلمان غلبۂ کفر کے تحت زندگی گزار رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ مفروضہ بجائے خود غلط ہے۔ اس ملک میں "کفر" کا اقتدار نہیں ہے بلکہ "سیکولرزم" کا اقتدار ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ یہاں غلبۂ کفر کی حالت نہیں ہے بلکہ غلبۂ ناطرفداری کی حالت ہے۔ یہ صورت حال عین ہمارے حق میں ہے۔ اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے اس کو ہمیں بھرپور طور پر استعمال کرنا چاہئے۔

۲۹ مارچ کی دوپہر کو محمدیہ احسانیہ ہائر سکنڈری اسکول (ستنا) میں پروگرام تھا۔ شہر کے مسلم اہل فکر اور اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات اکٹھا ہوئے۔ اس موقع پر علم کی اہمیت پر گفتگو کی گئی۔ میں نے بتایا کہ علم کا تعلق سروس سے محض ثانوی ہے۔ علم بذات خود مطلوب ہے۔ علم سے ذہن وسیع ہوتا ہے۔ آدمی دین کا اور تاریخ کا مطالعہ کرتا ہے اور اس طرح اس قابل بنتا ہے کہ زیادہ گہری واقفیت کے ساتھ زندگی کی منصوبہ بندی کر سکے۔ اس بات کو تاریخ کی مثالوں سے واضح کیا گیا۔

نذیر آباد (ستنا) کی مسجد میں ۳۰ مارچ کو نماز فجر کے بعد درس تھا۔ قرآنی آیات اور احادیث کی روشنی میں دین میں شکر کی اہمیت بتائی گئی اور یہ بتایا گیا کہ دوزخ اور جنت کیا ہے، اور کس قدر ضروری ہے کہ آدمی دوزخ سے بھاگے اور جنت کا حریص بنے۔

۲۹ مارچ کو دن میں ۲ بجے ستنا کے ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن میں پروگرام تھا۔ پورا ہال وکیل صاحبان سے بھرا ہوا تھا۔ ڈسٹرکٹ جج اور مجسٹریٹ صاحبان بھی موجود تھے۔

میں نے تقریر شروع کرتے ہوئے ایک واقعہ بیان کیا۔ دہلی میں میری ملاقات ایک وکیل صاحب سے ہوئی۔ وہ فوجداری میں وکالت کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہم لوگ پورا مقدمہ ایف

آئی آر (F.I.R) پر چلاتے ہیں۔ ہم اس کھوج میں نہیں پڑتے کہ واقعہ کی اصلیت کیا ہے۔ اگر وکیل واقعہ کی اصلیت کو دیکھے تو پھر اس کا ٹائر پنکچر ہو جائے گا۔

میں نے کہا کہ آپ لوگ قانون داں ہیں۔ آپ معاملہ کے لیگل پہلو کو دیکھتے ہیں۔ مگر اسلام معاملہ کے اسپریچول پہلو کو دیکھتا ہے۔ وہ آدمی کے اندر کو متاثر کرتا ہے۔ وہ آدمی کے ٹائر کو پنکچر کر دینا چاہتا ہے۔

پھر میں نے کہا کہ ہر آدمی کے اندر بیک وقت دو قوتیں ہیں۔ ایک وہ جس کو قرآن میں نفس امّارہ کہا گیا ہے۔ اور دوسرا وہ جس کو نفس لوّامہ کیا گیا ہے۔ نفس امّارہ دراصل وہی چیز ہے جس کو آج کل انا (Ego) کہا جاتا ہے اور نفس لوّامہ سے مراد ضمیر (Conscience) ہے۔ اب یہ آپ کا امتحان ہے کہ آپ دونوں میں سے کس صفت کو جگاتے ہیں۔ اگر آپ نے آدمی کی انا کو جگایا تو اس کی سرکشی آپ کے حصہ میں آئے گی، اور اگر آپ نے اس کے ضمیر کو جگایا تو اس کے ضمیر کا فیصلہ آپ کے حصہ میں آئے گا۔

۲۷ مارچ کی شام کو مہاویر بھون (ستنا) میں پروگرام تھا۔ ہندو اور مسلمان دونوں بہت بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ تقریر کا موضوع "اسلام اور قیام امن" رکھا گیا تھا۔ میں نے کہا کہ دہلی کے ایک انگریزی اخبار میں حال میں ایک آرٹیکل چھپا تھا، جس کا عنوان تھا:

Bilateralism is Best

یعنی دوطرفہ طریقہ بہترین طریقہ ہے۔ دو فریق کے درمیان اختلاف اور شکایت ہو تو دونوں کو نصف نصف ذمہ داری لے کر معاملہ کو ختم کر دینا چاہئے۔ میں نے کہا کہ یہ بالکل غیر عملی بات ہے۔ اس دنیا میں "ففٹی ففٹی" کی بنیاد پر کبھی کوئی اختلافی مسئلہ ختم نہیں ہوتا۔ میں نے کہا کہ صحیح طریقہ اس کے برعکس ہے۔ صحیح طریقہ یک طرفہ طریقہ ہے:

Unilateralism is Best

مگر یک طرفہ طریقہ پر عمل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی کے دل میں انسانوں کے لئے محبت اور خیر خواہی کا دریا بہہ رہا ہو۔ چوں کہ لوگ نفرت میں اور ردعمل میں جیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ یکطرفہ طریقہ پر عمل نہیں کر پاتے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات سے بتایا کہ آپ نے قدیم عرب

میں اسی یکطرفہ طریقہ پر عمل کیا اور زبردست کامیابی حاصل کی۔

تقریر کے بعد ایک مسلمان بھائی ملے۔ انھوں نے کہا کہ میں فیض آباد کا رہنے والا ہوا، یہاں بزنس کے سلسلے میں آیا تھا۔ پروگرام کی خبر سُن کر یہاں آگیا۔ میں آپ کی بات سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کی ایک تقریر فیض آباد میں رکھی جائے۔ وہاں آپ جیسے رہنماؤں کی سخت ضرورت ہے۔

اس جلسہ کے صدر مسٹر شیام سندر شرما (اڈیٹر ویش بندھو) تھے۔ انھوں نے آخر میں اپنی صدارتی تقریر کی اور کہا کہ میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار اسلام پر اتنی اعلیٰ تقریر سنی ہے۔ انھوں نے اپنے غیر معمولی تاثر کا اظہار کیا۔

ستنا سے قریب پنّا ہے جہاں ہیرے کی کانیں ہیں۔ یہاں بھی الرسالہ جارہا ہے۔ پنا سے آٹھ آدمی ستنا آئے اور پروگرام میں شریک رہے۔ وہ لوگ مجھ کو پنا لے جانا چاہتے تھے مگر وقت کی کمی کے باعث میں وہاں نہ جا سکا۔ انھوں نے بتایا کہ پنا میں باشعور طبقہ برابر الرسالہ کا مطالعہ کر رہا ہے اور اس سے اثر قبول کر رہا ہے۔ وہاں کی ایجنسی کے تحت انگریزی الرسالہ بھی جارہا ہے۔ ایک ہندو تعلیم یافتہ استاذ نے انگریزی الرسالہ پڑھ کر کہا کہ الرسالہ ایک الیشوری دین ہے، اس کے ذریعے خدا نے اپنے بندوں کی رہنمائی کا انتظام کیا ہے۔

خطاب عام کے علاوہ، قیام گاہ پر لوگ جمع ہوتے رہے اور مختلف دینی اور ملی موضوعات پر اظہار خیال کا موقع ملا۔ ستنا کی ایک مجلس میں ایک صاحب نے جماعت تبلیغ پر کچھ شخصی اور جزئی نوعیت کے اعتراضات کئے۔ میں نے کہا کہ اعتراض کا یہ طریقہ صحیح نہیں۔ یہ ایک قسم کی سائڈ ٹریکنگ ہے۔ اور سائڈ ٹریکنگ کبھی کسی آدمی کے لئے مفید نہیں ہوتی۔ کسی مشن کے سلسلہ میں ہمیشہ یہ دیکھنا چاہئے کہ اس کا اصل مقصد کیا ہے، اور اصل مقصد کی روشنی میں اس پر رائے قائم کرنا چاہئے۔ جزئی شوشوں اور شخصی قصوں کے پیچھے دوڑنا ایک غیر اسلامی فعل ہے، یہ طالب حق کا طریقہ نہیں۔

پھر میں نے کہا کہ اس وقت ملت میں دو قسم کی کوششیں چل رہی ہیں۔ ایک کو میں اپنے الفاظ میں خارج اور نیسٹڈ کہوں گا، اور دوسری کو داخل اور رینسٹڈ۔ میرے مطالعہ کے مطابق تبلیغی جماعت واحد جماعت ہے جس کو داخل اور رینسٹڈ تحریک کہا جاسکتا ہے۔ اس ایک کے سوا جتنی بھی تحریکیں ملت

کے اندر چل رہی ہیں، وہ تقریباً بلا استثناء خارج اور اینٹڈ ہیں۔ اس کے بعد میں نے وہ حدیث سنائی جس میں بتایا گیا ہے کہ "قلب" کی اصلاح پورے "جسم" کی اصلاح کا ذریعہ ہے۔ اور قلب کا بگاڑ پورے جسم کے بگاڑ کا ذریعہ۔

یہ ہے وہ اصلی فرق جو تبلیغی جماعت اور دوسری جماعتوں میں پایا جاتا ہے۔ نہ کہ وہ شخصی اور جزئی باتیں جو آپ نے فرمائیں۔ پھر میں نے کہا کہ میں نے قرآن و حدیث کا جو مطالعہ کیا ہے، اس کے مطابق میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ داخل اور اینٹڈ طریقہ ہی پیغمبرانہ طریقہ ہے۔ اس کے برعکس خارج اور اینٹڈ سرگرمیاں جن میں لوگ مشغول ہیں وہ سراسر غیر پیغمبرانہ ہیں۔ اس قسم کی خارجی سرگرمیوں سے نہ اب تک کوئی حقیقی دینی کام ہوا ہے اور نہ آئندہ ہو سکتا ہے۔ جو لوگ ان خارجی سرگرمیوں سے اعلیٰ نتائج کی امید کر رہے ہیں وہ ببول کے درخت سے آم کی فصل کی امید کئے ہوئے ہیں۔ ایسی امید خدا کی اس دنیا میں کبھی پوری ہونے والی نہیں۔

ستنا میں ایک اندوہناک تجربہ سامنے آیا۔ ایک مسلمان بزرگ مجھ سے ملے۔ وہ ساٹھ سال کی عمر میں ۸۰ سال کے معلوم ہو رہے تھے۔ بدن پر معمولی کپڑا تھا۔ اور سوکھے چہرے پر ہڈیاں نمایاں ہو رہی تھیں۔ انھوں نے کہا: "حضرت، میرے لئے دعا فرمائیں"۔ میں نے کہا، اللہ آپ کی مدد فرمائے۔ انھوں نے بتایا کہ میرے یہاں دو بچیاں ہیں۔ ان کی شادی کا مسئلہ سر پر ہے۔ آجکل شادی پیسہ سے ہوتی ہے۔ مگر میرے پاس پیسہ نہیں۔ چار بڑے لڑکے ہیں۔ وہ اچھی کمائی کر رہے ہیں، لیکن سب کے سب مجھ سے الگ ہیں۔ ان سے کسی مدد کی امید نہیں۔ مجھے ان کے حالات سن کر بہت دکھ ہوا۔ اور اپنے دل میں دیر تک ان کے لئے دعا کرتا رہا۔

یہ مسلمان درحقیقت موجودہ مسلم سماج کی تصویر تھا۔ موجودہ مسلم سماج اپنوں کے ظلم اور خود غرضی اور غیر شرعی رسم و رواج کے نیچے پس رہا ہے۔ مگر کوئی مسلمان اپنے ان ستم رسیدہ بھائیوں کا ساتھ دینے والا نہیں۔ البتہ غیروں کی طرف سے اگر شریعت میں مداخلت کا کوئی شوشہ مل جائے تو ساری قوم جوش و خروش سے بھر جاتی ہے۔ اپنوں کی ہزاروں گنا بڑی مداخلت سے شریعت اسلامی کی دھجیاں اڑائی جا رہی ہیں مگر اس قسم کی باتوں پر مسلمانوں کے درمیان کوئی حرکت پیدا نہیں ہوتی۔

قوم کے سطحی لیڈروں نے بھی قوم کے مزاج کے ساتھ سمجھوتہ کر رکھا ہے۔ وہ مسلم سماج کے داخلی

مسائل کے لئے نہیں اٹھتے۔ کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ اس قسم کے مسائل پر انھیں کبھی لیڈری نہیں ملے گی۔ البتہ غیر قوم کی طرف سے مداخلت فی الدین کا کوئی قصہ ہاتھ آجائے تو فوراً اس کو لے کر اٹھ جاتے ہیں۔ اور جاہل مسلمانوں کی بھیڑ جمع کر کے اپنی شان قیادت میں اضافہ کرتے ہیں۔ مگر لوگوں کو جاننا چاہئے کہ یہ عین وہی چیز ہے جس کو قرآن میں افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض (البقرہ ۸۵) کہا گیا ہے۔ اس قسم کی سرگرمیاں صرف خدا کے غضب کا مستحق بنانے والی ہیں، وہ خدا کے انعام کو کھینچنے والی نہیں۔

۳۰ مارچ ۱۹۸۸ کی شام ستنا سے دہلی کے لئے روانگی ہوئی۔ ڈبہ میں داخل ہوا تو معلوم ہوا کہ میری برتھ اوپر ہے۔ اشارۃً میری زبان سے نکلا کہ "لوربرتھ" ہوتی تو زیادہ اچھا تھا۔ رزرویشن کے مطابق یہ لوربرتھ ایک ہندو افسر کے پاس تھی۔ ان سے میں نے کچھ نہیں کہا تھا۔ یہ بات میں نے ان لوگوں سے کہی تھی جو مجھے پہنچانے کے لئے ریلوے اسٹیشن تک آئے تھے۔ ہندو افسر کو میرے احساس کا علم ہو گیا انھوں نے فوراً کہا کہ آپ نیچے کی برتھ لے لیں، میں اوپر چلا جاتا ہوں ——— حقیقت یہ ہے کہ ہر آدمی "انسان" ہے۔ وہ صرف اس وقت "غیر انسان" بن جاتا ہے جب کہ اس کی انا کو چھیڑ دیا جائے۔

میری واپسی دوبارہ قطب ایکسپریس سے ہوئی۔ ۳۰ اور ۳۱ مارچ کی درمیانی رات کو ٹرین میں ایک انوکھا حادثہ پیش آیا۔ سفر کے دوران میں ضرورت کے تحت ٹوائلٹ میں گیا۔ اس وقت میں چپل پہنے ہوئے تھا۔ اتفاق سے میرے بائیں پاؤں کا چپل پاؤں سے نکل گیا۔ وہ پھسل کر قدمچہ کے درمیان سوراخ تک پہنچا اور ایک لمحہ میں اس کے اندر داخل ہو کر نیچے گر گیا۔ یہ واقعہ چلتی ہوئی ٹرین میں پیش آیا، اس لئے چپل کو دوبارہ حاصل کرنا ممکن نہ ہو سکا۔

اچانک خیال آیا کہ یہ حادثہ زمین کی کشش کی وجہ سے ہوا۔ اگر زمین میں کشش نہ ہوتی تو چپل جہاں تھا وہیں پڑا رہتا، وہ گر کر نیچے نہ جاتا۔ پھر فوراً ہی میں نے سوچا کہ اگر زمین میں کشش نہ ہوتی تو ٹرین بھی نہ دوڑتی۔ حتی کہ وہ فیکٹری بھی قائم نہ ہو سکتی جہاں جوتے اور چپل بنیں اور کوئی شخص ان کو پہن کر سفر کرے۔ خدا کی دنیا میں (اور اسی طرح خدا کے دین میں بھی) مختلف پہلوؤں کے درمیان ایک نازک توازن قائم رکھا گیا ہے۔ جو لوگ توازن کی اس حقیقت کو نہیں سمجھتے وہ عجیب عجیب غلط فہمیوں میں پڑ جاتے ہیں، دنیا کے بارہ میں بھی اور خود دین کے بارہ میں بھی۔

غلط ذہن

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطبین آپ سے "آیت" مانگتے تھے۔ اس کے جواب میں فرمایا گیا کہ کیا تمھیں "بینہ" نہیں دے دیا گیا۔ آیت سے مراد حسی معجزہ ہے اور بینہ سے مراد آپ کی پیغمبرانہ صداقت کی وہ دلیل ہے جو لفظی طور پر سابق کتب سماوی میں ملتی ہے۔ لفظی دلیل میں چونکہ توجیہہ و تعبیر کی گنجائش رہتی ہے۔ اس لئے انھوں نے کہا کہ ہمارے سامنے ایسی حسی دلیل پیش کرو جس سے انکار کی گنجائش ہی نہ ہو (طٰہٰ ۱۳۳-۳۵)

فرمایا کہ اصل مسئلہ دلیل کا نہیں، اصل مسئلہ تمہاری ذہنیت کا ہے۔ تم چونکہ حق ناحق کے بارہ میں سنجیدہ نہیں ہو اس لئے دلیل کا دلیل ہونا تمہیں دکھائی نہیں دیتا۔

صداقت جب بھی ظاہر ہوتی ہے، وہ اپنی دلیل آپ بن کر ظاہر ہوتی ہے۔ مگر اس کی دلیل کو پانا اور اس کا اقرار کرنا صرف اس وقت ممکن ہے جب کہ آدمی اس کے بارہ میں سنجیدہ ہو، لوگوں کی عصبیت اور مفاد پرستی انھیں حق کے بارہ میں سنجیدہ ہونے نہیں دیتی۔ وہ اپنے دماغ کو حق اور ناحق کی بحث میں زیادہ مشغول نہیں کرتے۔ وہ اس موضوع پر زیادہ سنجیدگی کے ساتھ غور نہیں کرتے۔ اس بنا پر وہ دلیل کے وزن کو بھی محسوس نہیں کر پاتے۔ وہ دلیل پیش کئے جانے کے باوجود اس طرح بولتے رہتے ہیں جیسے کہ ابھی ان کے سامنے دلیل پیش ہی نہیں کی گئی۔

ظالم انسان اس وقت تک اقرار نہیں کرے گا جب تک وہ اقرار کے لئے مجبور نہ کر دیا جائے۔ قیامت کے ظہور کے بعد ایسا ہی ہوگا۔ مگر اس وقت کے اقرار کا کیا فائدہ۔ وہ تو انجام بھگتنے کا وقت ہوگا نہ کہ ماننے یا عمل کرنے کا۔

انسان کا حال یہ ہے کہ اگر خدا کی طرف سے کوئی پیغام دینے والا آئے تو وہ اس سے جھوٹی بحثیں کرتا ہے۔ اور اگر خدا کوئی پیغام دینے والا نہ بھیجے اور بتائے بغیر لوگوں کو ان کی غلط روش پر پکڑ لے تو وہ کہیں گے کہ آپ نے ہم کو خبردار کیوں نہیں کیا۔ اگر ہم کو پہلے بتا دیا گیا ہوتا تو ہم ہرگز اس کے خلاف نہ کرتے۔ وہ دونوں حالتوں میں غلط روش اختیار کرتا ہے۔

ہدایت اگرچہ داعی کی طرف سے سامنے آتی ہے، مگر اس کو قبول کرنے کا انحصار تمام تر مدعو کے اوپر ہوتا ہے۔ مدعو کے اندر اگر طلب ہوگی تو وہ ہدایت کو پائے گا، ورنہ وہ اس سے محروم رہے گا۔

۱۔ ایک بیرونی ملک کے ایک بڑے ادارہ نے اسلامی مرکز کی انگریزی کتابوں کو دیکھنے کے بعد اس سے دل چسپی کا اظہار کیا ہے اور پہلی قسط کے طور پر ہر انگریزی کتاب ۲۰۰ کی تعداد میں منگائی ہے۔ ۲۴ مارچ ۱۹۸۸ کو تمام کتابیں دو دو سو کی تعداد میں بذریعہ ہوائی جہاز روانہ کر دی گئی ہیں۔ اس ادارہ کے ذریعہ یہ کتابیں بین اقوامی سطح پر تعلیم یافتہ غیر مسلم حضرات تک پہنچیں گی۔

۲۔ ہندستان کے زندہ مذاہب (Living religions in modern India) پر ایک جاپانی خاتون ریسرچ کر رہی ہیں۔ اس موضوع پر وہ جاپانی زبان میں ایک کتاب تیار کریں گی۔ انھوں نے بتایا کہ ان کی کتاب کے ۱۰ ہزار نسخوں کے آڈر ابھی سے پیشگی طور پر بک ہو چکے ہیں۔ ان کی ریسرچ میں اسلام بھی شامل ہے۔ اس سلسلہ میں اسلام کو سمجھنے کے لیے وہ ۱۰ مارچ ۱۹۸۸ کو اسلامی مرکز میں آئیں اور صدر اسلامی مرکز سے اسلام کی تعلیمات کے بارہ میں تفصیلی معلومات حاصل کیں۔ ان کا نام و پتہ یہ ہے:

Yuko Nishimura, Faculty of Religious Studies
University of Tokyo, Tokyo 113, Japan (03-4064776)

۳۔ مسٹر کروبر (A.R. Kroeber) کا ذکر اس سے پہلے خبرنامہ (مئی ۱۹۸۸) میں آچکا ہے۔ دوسری بار وہ ۴ اپریل ۱۹۸۸ کو مرکز میں آئے اور دو گھنٹہ تک صدر اسلامی مرکز سے اسلام کے بارہ میں گفتگو کی۔ ان کے پاس قرآن کا انگریزی ترجمہ (پکتھال اور آربری) تھا۔ قرآن کو انگریزی ترجمہ کے ذریعہ پڑھ کر ان کے ذہن میں بہت سے سوالات تھے۔ ان سوالات پر انھوں نے صدر اسلامی مرکز سے وضاحت طلب کی۔ آخر میں انھوں نے کہا کہ میرے اکثر سوالات کا جواب مجھے مل گیا۔ مزید مطالعہ کے بعد میں پھر ملاقات کروں گا۔ اسلامی مرکز کی انگریزی مطبوعات وہ اپنے ساتھ لے گیے ہیں۔

۴ ساؤتھ افریقہ کے ایک صاحب نے گاڈ ارائزز (God Arises) پڑھی۔ اپنے خط مورخہ ۲۴ مارچ ۱۹۸۸ میں انھوں نے لکھا ہے کہ وہ اس کتاب کو اپنے یہاں سے چھاپ کر افریقہ اور مغربی

ممالک میں پھیلائیں گے۔ اس کتاب کے بارہ میں انھوں نے اپنا تاثر حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے :

Very enlightening indeed, scholarly work no doubt.

۵۔ کلکتہ یونیورسٹی کے سابق پروفیسر ڈاکٹر ہیرالال چوپڑا آج کل الرسالہ کا مطالعہ کر رہے ہیں اور مرکز کی کئی کتابیں پڑھی ہیں۔ اسی تاثر کے تحت وہ ۴ اپریل کو مرکز میں آئے اور صدر اسلامی مرکز سے ملاقات کی۔ انھوں نے اپنا ایک تحریری تاثر دیا جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ "مولانا وحید الدین خاں صاحب نے کتاب (ظہور اسلام) لکھ کر بنی نوع انسان پر بڑا بھاری احسان کیا ہے"۔ ان سے ملاقات کا تفصیلی تذکرہ انشاء اللہ ایک علٰحدہ مضمون میں شائع کیا جائے گا۔ مرکز کی مطبوعات کا وہ گہری دل چسپی کے ساتھ مطالعہ کر رہے ہیں۔

۶۔ آج کل کچھ لوگ اپنے حقیر مقاصد کے لیے الرسالہ کے تعمیری مشن کے خلاف جھوٹی الزام بازی کی مہم چلا رہے ہیں۔ دوسری طرف اللہ کے فضل سے الرسالہ کا فکر عالمی سطح پر پھیلتا چلا جا رہا ہے جس کی شہادتیں بار بار مختلف صورتوں میں سامنے آ رہی ہیں۔ سعودی عرب کے سب سے زیادہ کثیر الاشاعت جریدۃ الدعوۃ (۱۰ شعبان ۱۴۰۸ھ مطابق ۲۸ مارچ ۱۹۸۸) نے صفحہ ۵۰ پر "الشوط الاخیر" کے مستقل عنوان کے تحت ایک مضمون شائع کیا ہے جس میں الرسالہ کے نقطۂ نظر کی واضح تائید ہے۔ اس مضمون میں کہا گیا ہے کہ اولاً ہمیں تحتی مستوی پر کام کرنا چاہیے تاکہ اگلے مرحلہ میں ہم سیاسی مستوی کو متاثر کر سکیں۔ مضمون کے آخری الفاظ یہ ہیں : فلنبدأ بما نملك حتى يحقق الله لنا ما لا نملك ولنصلح القاعدة حتى يصلح الله القمة۔ یہ الفاظ الرسالہ کی فکر سے اتنا زیادہ مطابق ہیں کہ وہ اس کا ترجمہ معلوم ہوتے ہیں۔

۷۔ جناب ایم۔ بی۔ پیرزادہ جو سعودی عرب میں رہتے ہیں، انھوں نے اپنے خط ۲۵ مارچ ۱۹۸۸ کے مطابق، اپنی طرف سے زرتعاون ادا کر کے اپنے دس دوستوں اور رشتہ داروں کے نام الرسالہ اردو اور انگریزی جاری کرایا ہے۔ اسی طرح اور بھی بہت سے لوگ کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ کو مزید آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ دعوت دین اور تعمیر ملت کے مشن کی توسیع

کے لیے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اس طریقہ پر عمل کرنا چاہیے۔

۸۔ کل ہند صنعتی نمائش حیدرآباد (مارچ۔اپریل ۱۹۸۸) میں الرسالہ بک اسٹال لگایا گیا جس کے ذریعہ اسلامی مرکز کی کتابوں کی کافی تشہیر ہوئی اور تقریباً سات سو افراد نے الرسالہ کی خریداری قبول کی۔ جس میں اکثر اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ لوگوں نے الرسالہ کے ساتھ کتابیں بھی حاصل کیں اور اچھے تاثرات کا اظہار کیا۔ ایک قاری جو عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں پروفیسر ہیں، انھوں نے کہا "مولانا کی تحریروں کی آئندہ زمانہ میں بہت ضرورت محسوس کرکے اس کو پھیلایا جائے گا۔ اِس وقت لوگ مولانا کی فکر کو سمجھ نہیں پا رہے ہیں"۔ الرسالہ فری بک لائبریری سے بھی کافی حضرات استفادہ کر رہے ہیں اور الرسالہ اکیڈمی حیدرآباد کی جانب سے بھرپور کوشش کی جارہی ہے کہ مولانا کی فکر کو زیادہ سے زیادہ عوام وخواص میں پھیلایا جائے۔ حیدرآباد میں چھوٹے بڑے ہر اجتماعات میں الرسالہ بک اسٹال لگایا جاتا ہے۔ اس سے بھی کافی لوگ متعارف ہو رہے ہیں، اضلاع پر بھی اسٹال لگانے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس طرح مولانا کی فکر کا کام دن بدن ترقی کی طرف گامزن ہے۔ (الرسالہ اکیڈمی، حیدرآباد)

۹۔ کالی باڑی مارگ (نئی دہلی) میں ۱۲ مارچ ۱۹۸۸ کو ایک اجتماع ہوا۔ تعلیم یافتہ مسلمان اور غیر مسلم صاحبان شریک ہوئے۔ صدر اسلامی مرکز نے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ خطاب کیا۔ موضوع تھا: نظریہ شہادت قرآن وحدیث کی روشنی میں۔ تقریر کا انداز اگرچہ رواجی ذہن سے الگ تھا۔ تاہم لوگوں نے بہت توجہ کے ساتھ سنا اور گہرے تاثر کا اظہار کیا۔ اس تقریر کا ٹیپ بعض صاحبان کے پاس موجود ہے۔

۱۰۔ ایک دعوتی پروگرام کے تحت صدر اسلامی مرکز نے مدھیہ پردیش کے بعض مقامات (ستنا، ریوا) کا سفر کیا۔ یہ سفر مارچ ۱۹۸۸ میں ہوا۔ اس کی روداد انشاء اللہ سفرنامہ کے ذیل میں تفصیل کے ساتھ شائع کر دی جائے گی۔ الرسالہ کے ہمدرد حضرات اس علاقہ میں الرسالہ کے فکر کو پھیلانے میں پوری طرح مشغول ہیں۔

۱۱۔ الرسالہ کے دفتر کے لیے چند محنتی کلرک اور ایک لائق منیجر کی ضرورت ہے۔ صاحب صلاحیت افراد اپنی درخواست بذریعہ ڈاک روانہ فرمائیں۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۴۸ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۵۰ روپیہ

بیرونی ممالک سے

ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

تذکیر القرآن

جلد اوّل : سورۃ فاتحہ ۔ سورۃ بنی اسرائیل

جلد دوم : سورۃ الکہف ۔ سورۃ الناس

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہم قرآن کی کنجی ہے۔

ہدیہ جلد اول ۱۰۰ روپیہ

جلد دوم ۱۰۰ روپیہ

مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

	Rs
تذکیر القرآن جلد اول	100/-
〃 〃 جلد دوم	100/-
اللہ اکبر	40/-
پیغمبر انقلاب	30/-
مذہب اور جدید چیلنج	35/-
عظمتِ قرآن	25/-
الاسلام	25/-
ظہورِ اسلام	25/-
اسلامی زندگی	20/-
احیاءِ اسلام	20/-
رازِ حیات (مجلد)	45/-
صراطِ مستقیم	25/-
خاتونِ اسلام	35/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
اسلام اور عصرِ حاضر	20/-
حقیقتِ حج	25/-
اسلامی تعلیمات	20/-
تبلیغی تحریک	15/-
تعبیر کی غلطی	35/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-
دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	6/-
تجدیدِ دین	4/-
اسلام دینِ فطرت	4/-
تعمیرِ ملّت	4/-
تاریخ کا سبق	4/-
مذہب اور سائنس	8/-
عقلیاتِ اسلام	4/-
فسادات کا مسئلہ	3/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	3/-
تعارفِ اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	4/-
ایمانی طاقت	4/-
اتحادِ ملّت	4/-
سبق آموز واقعات	4/-
زلزلۂ قیامت	6/-
حقیقت کی تلاش	4/-
پیغمبر اسلام	4/-
آخری سفر	4/-
اسلامی دعوت	4/-
خدا اور انسان	4/-
حل یہاں ہے	6/-
سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	4/-
حیاتِ طیبہ	4/-
باغِ جنّت	4/-
نارِ جہنّم	4/-
میوات کا سفر	25/-

God Arises	Rs. 45/-
Muhammad The Prophet of Revolution	50/-
Religion and Science	25/-
Tabligh Movement	20/-
The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Muhammad The Ideal Character	4/-
Man Know Thyself !	4/-
इन्सान अपने आपको पहचान	2/-
सच्चाई की तलाश	4/-

مکتبہ الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

Rs. 4